ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۱۹-۲۶ اگست ۱۹۷۱ء

جنوبی چین کی سرخ سرزمین

ایک پاکستانی نے کیا دیکھا؟

قیمت :- ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے :- ۶۰ پیسے

پاکستان کی قومی جنگ ۱۹۶۵ء

کے جذبے کو تازہ رکھنے کیلئے

ہفت روزہ الفتح کراچی

ستمبر کے پہلے ہفتے میں

اشاعتِ خاص پیش کر رہا ہے

مندرجات

- پاکستان کی قومی جنگ اور پاکستان کے عوام
- بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم
- پاکستانی عوام کے لئے چین کی لازوال حمایت کی داستان
- امریکہ برطانیہ اور روس کی سازشیں
- تاشقند کا المیہ اور کشمیر کا مسئلہ
- سلامتی کونسل میں بھٹو کی یادگار تقریر کا متن (دوبارہ)
- ۱۵ اگست سے ۱۰ جنوری تک ۔ جہادِ کشمیر سے تاشقند کے المیہ تک خبروں کا انتخاب

چند لکھنے والے

- احمد ندیم قاسمی
- صفدر میر
- خالد علیگ
- فارغ بخاری
- ضیاء سرحدی
- ڈاکٹر رشید حسن خاں
- عبدالحمید چھاپرا
- شمیم الرحمان
- مولانا کوثر نیازی
- عبدالحمید عدم
- شوکت صدیقی
- عنایت اللہ
- اقبال مہر
- ظفراللہ پوشنی
- افضل صدیقی
- محمد میاں

اشاعتِ خاص کا سرورق : ۷ رنگوں میں
پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو کے انٹرویو
کے ساتھ آرٹ پیپر پر سات رنگوں میں تصویر
(فریم بھی کرایا جاسکتا ہے)

ضخامت :- معمول سے کہیں زیادہ
قیمت :- ایک روپیہ

جنگِ ستمبر کے بارے میں
ذوالفقار علی بھٹو کا انٹرویو

ایجنٹ حضرات

۲۴ اگست تک اپنی مطلوبہ تعداد سے آگاہ فرمادیں۔ سالنامے کے آرڈر تاخیر سے ملنے کی صورت میں ادارہ پوری تعداد میں پرچے ارسال نہیں کرسکا

مشتہرین حضرات ۲۸ اگست ۷۱ء تک اپنے اشتہارات بھیج سکتے ہیں۔

(جنرل مینجر)

ادار یہ

چین سے دفاعی معاہدہ کیجیے

گرومیکو صاحب نئی دہلی آئے اور سورن سنگھ سے معاہدہ کرکے چلے گئے۔ اس معاہدے پر پاکستانی محکمۂ خارجہ نے محض حیرت کا اظہار کیا اور دُنیا بھر نے اس کی مختلف تاویلیں کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاہدہ پاک چین دوستی کے خلاف ہے امریکہ اور چین کے درمیان نئی سیاسی تبدیلیوں کے بعد روس ایشیا میں اپنے آپ کو تنہا سمجھنے لگا تھا۔ اسی لئے اُس نے اتنی تیزی دکھائی اور بھارت سے کھلم کھُلا معاہدہ کرکے اپنی غیر جانبداری کا بھرم کھول دیا۔

یہ معاہدہ اور کسی کے خلاف ہو یا نہ ہو لیکن موجودہ سیاسی صورتِ حال میں پاکستان کے خلاف ضرور ہے اور اس پر کبھی بھی عمل کا جواز ڈھونڈنا ہو تو قریب ترین شکار پاکستان ہی ہو سکتا ہے۔ بھارت نے تو آج تک پاکستان کو سچّے دل سے تسلیم نہیں کیا اور اس کی ابتدا سے ہی کوشش رہی ہے کہ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہڑپ کرے۔ بھارت کے یہ توسیع پسندانہ عزائم کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ چین سے بھی وہ ایک لڑائی چھیڑ کر عبرت ناک شکست کھا چکا ہے۔ پہلے بھارت کو مستقل طور پر امریکہ کی پناہ حاصل رہتی تھی بعد میں امریکہ روس کی پُر امن بقائے باہمی کی پالیسی چلی تو بھارت کو روس کی حمایت بھی حاصل ہو گئی۔ ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک روس اور امریکہ بھارت کو کھُل کر اقتصادی اور فوجی امداد دے چکے ہیں۔ اور برِصغیر میں فوجی طاقت میں عدم توازن پیدا کر چکے ہیں۔ روس کا حالیہ معاہدہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ معاہدہ پُورے ۲۰ برس کے لئے کیا گیا ہے۔ اس لئے پاکستان کے عوام حکومتِ پاکستان سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اسے فوری طور پر چین سے دفاعی معاہدہ کر لینا چاہیئے اور یہ اس وقت تک کے لئے ہونا چاہیئے جب تک چین اور پاکستان کے درمیان اُصولوں کی بنیاد پر دوستی قائم ہے اس معاہدے کے ذریعے ہی روس اور بھارت کا دماغ صحیح ہو سکتا ہے اور دُوسرے برِصغیر میں فوجی طاقت کا توازن بحال ہو سکتا ہے۔

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد: ۲ شمارہ: ۱۴

۱۹-۲۶ اگست ۱۹۷۱ء

نگران
شوکت صدیقی
محمود شام

مدیر
ارشاد راؤ

معاونین خصوصی
ابراہیم جلیس، افضل صدیقی، عبدالحمید چھاپرا

مجلسِ ادارت
وہاب صدیقی — نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر
غلام نبی بزمی

بدل اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت: ۶۰ فلس دوبئی قطر: ۷۵ درم
سعودی عرب: ۱۵ قرش۔ انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۸۰ ڈی، نرسری کمرشل ایریا۔
پی ای سی ایچ ایس ۔ کراچی ۲۹

ایڈیٹر پبلشر، ارشاد راؤ
مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد۔ کراچی

رُوس بھارت معاہدہ

دو توسیع پسندوں کا گٹھ جوڑ ہے

وہاب صدّیقی

مشرقِ وسطیٰ میں امریکی سامراج سے پے در پے شکستیں کھانے کے بعد سوویت یونین برصغیر پاک و ہند پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ گو یہ خطّہ اب "سونے کی چڑیا" نہیں رہا کہ اس کے پر نوچ کر دولت کے دریاؤں کا رُخ مغرب کی طرف موڑ دیا جائے۔ لیکن "ہاتھی لاکھ مرے پھر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے" کے مصداق برصغیر جغرافیائی اعتبار سے ایشیا میں انتہائی ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔

روس ایک مدّت سے اس خطّہ پر دانت لگائے ہوئے تھا۔ افغانستان پہلے ہی اس کے حلقۂ یاراں میں شریک تھا، پاکستان اور بھارت کو اپنے دائرہ اثر میں لینے کے لئے "ایشیائی تحفظ کا منصوبہ" پیش کیا گیا، لیکن پاکستانی عوام اس کباب میں ہڈی بن گئے۔ یہ حربہ ناکام ہوا تو روس نے بحیرہ ہند میں اپنی طاقت میں زبردست اضافہ کیا۔ اب اس کی بین البراعظمی میزائل بردار آبدوز کشتیاں بحیرہ ہند میں گشت کر رہی ہیں۔ گزشتہ دنوں کریملن کے نئے زاروں کے ایک نمائندے ـــ گرومیکو نے بھارت کا دورہ کیا تو پوری دنیا پردہ اُٹھنے کی منتظر تھی۔ یہ پردہ ۹ اگست ۱۹۷۱ء کو اُٹھا۔ اس میں سے روس اور بھارت کے درمیان بیس سالہ "دوستی، امن اور تعاون" کا معاہدہ برآمد ہوا۔ جس میں طے پایا:

- "اگر معاہدے میں شامل کسی ایک فریق پر حملہ ہوا یا حملہ کا خطرہ پیدا ہوا تو معاہدے کے فریق فوراً باہمی صلاح مشورہ کریں گے تاکہ یہ خطرہ دُور ہو سکے اور اپنے ملکوں کی سلامتی اور امن کے لئے مناسب اور مؤثر اقدامات کئے جائیں۔
- دونوں ملک ایسے کسی فوجی معاہدے اور اتحاد میں شامل نہیں ہوں گے جو معاہدہ کے کسی فریق کے خلاف ہوگا۔
- دونوں ملک ایک دوسرے پر جارحیّت کے ارتکاب سے گریز کریں گے اور اپنے علاقوں کو دوسرے فریق پر فوجی حملے کے لئے استعمال بھی نہیں ہونے دیں گے۔
- فریقین میں سے کسی پر اگر کسی تیسرے ملک نے حملہ کیا تو دوسرا فریق حملہ آور کو کسی قسم کی مدد نہیں دے گا۔
- دونوں ملک ایشیا اور پوری دنیا میں قیامِ امن کی کوششیں جاری رکھیں گے۔
- یہ معاہدہ بیس سال کے لئے ہوگا۔ ہر پانچ سال کے بعد خود بخود اس کی تجدید ہوتی رہے گی بشرطیکہ کوئی فریق اُسے منسوخ نہ کر دے۔ معاہدے کی توثیق ایک ماہ کے اندر کرنا ہوگی۔"

"دوستی، امن اور تعاون" کا یہ معاہدہ دراصل دفاعی معاہدہ ہے جو پاکستان اور چین کے خلاف کیا گیا ہے۔ معاہدے کی اس شق "فریقین میں سے کسی پر اگر کسی تیسرے ملک نے حملہ کیا تو دوسرا فریق حملہ آور کو کسی قسم کی مدد نہیں دے گا" کا مقصد پاک بھارت جنگ کی صورت میں پاکستان کو اسلحہ کی ترسیل روکنا ہے کیونکہ صدر یحییٰ نے گزشتہ دنوں مشرقی پاکستان کے واقعات پر بھارت سے جنگ کے امکانات کا اظہار کیا تھا۔ اس معاہدے کی وجہ سے بھارت کا جنگ باز حکمران ٹولہ مزید جارحانہ اقدام پر اُتر آیا ہے۔ اس معاہدے کو پارلیمان میں پیش کرتے ہوئے بھارتی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے کہا "اس معاہدے سے ان طاقتوں کو خبردار ہونا چاہیئے جو ہماری علاقائی سالمیت اور اقتدارِ اعلےٰ کے خلاف جارحانہ عزائم رکھتی ہیں" سردار جی کا اشارہ پاکستان کی طرف تھا حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ پاکستان اور چین دونوں بھارت کے خلاف جارحانہ عزائم نہیں رکھتے۔ یہ صرف بھارتی حکمران ہی ہیں جو چین اور پاکستان کا ہوّا دکھا دکھا کر غیر ممالک سے فوجی امداد لے رہے ہیں۔ اور جارحیّت کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔

یہ بھارت کا پہلا فوجی معاہدہ ہے۔ پنڈت نہرو نے بھارت کی خارجہ پالیسی غیر جانبداری کے اصولوں پر بنائی تھی۔ اس لئے وہ کسی فوجی معاہدے میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ لیکن بھارت کے موجودہ حکمرانوں نے یہ معاہدہ کر کے نہرو کی بنائی ہوئی پالیسی کو یکسر بدل ڈالا۔ یہ الگ بات ہے کہ نہرو کی بیٹی اور بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اب بھی غیر جانبدار پالیسی کی رٹ لگا رہی ہیں۔ انہوں نے ۱۹ اگست کو "بنگلہ دیش" کے حامی مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا "اس معاہدے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نے اپنی غیر جانبداری کی پالیسی ترک کر دی ہے۔"

سوویت یونین کی پاکستان دشمنی محتاجِ تعارف نہیں۔ اس نے اعلانِ تاشقند کروایا جس کی رُو سے "پاکستان نے جو کچھ میدانِ جنگ سے حاصل کیا تھا وہ تاشقند کانفرنس کی میز پر ہار گیا۔" لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ روس کے اربابِ اقتدار نے خود ہی اعلانِ تاشقند کی دھجیاں اڑا دیں۔ حالانکہ وہ اس اعلان کو برصغیر میں "امن اور سلامتی" کی ضمانت سمجھتے تھے۔ اعلانِ تاشقند کی شق ۶ اور ۷ میں لکھا ہے:

- "دونوں رہنماؤں (ایوب خاں اور شاستری) نے اتفاق کیا کہ دونوں ممالک کے تعلقات کا بنیادی اصول یہ ہوگا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔
- دونوں ممالک ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ بند کر دیں گے۔ اور دوستانہ تعلقات کے لئے پروپیگنڈہ کریں گے۔"

اب جب کہ بھارت پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے اس کے خلاف زہر اُگل رہا ہے تو سوویت یونین بھارت کا ہمنوا بنا ہوا ہے۔ اس طرح روس کی نام نہاد پاک دوستی کا پول کھل جاتا ہے۔ اصلیت معلوم ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ روس کی خارجہ پالیسی

رُوس نے نازی جرمنی سے بھی معاہدہ کیا تھا

ہیں اشتراکی اصولوں کو دخل نہیں بلکہ وہ بھی سامراجی طاقتوں کی طرح اپنے مفادات کے تحت خارجہ پالیسی مرتب کرتا ہے۔

اشتراکیت کے بانی کارل مارکس اور اس کے رفیق خاص اینگلز نے مجرّد خارجہ پالیسیوں کو یکسر مسترد کرتے ہوئے اشتراکی ریاست کی خارجہ پالیسی کی بنیاد طبقاتی رویہ بنایا تھا اور کہا تھا "اخلاقیات اور انصاف کے وہ عام اور سادہ قوانین جو افراد کو اپنے نجی تعلقات میں بروئے کار لانے چاہئیں وہی قوانین قوموں کے مابین تعلقات کے اعلیٰ قوانین ہونے چاہئیں۔ ایسی خارجہ پالیسی مرتب کرنے کی جدوجہد محنت کشوں کی جدوجہد آزادی کا ایک حصہ ہے" کارل مارکس نے اشتراکی ریاستوں کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول یہ بنائے تھے۔ امن، مساوات، قوموں کا حق خود مختاری، تمام ممالک کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کا احترام، چنانچہ اُس نے کہا تھا:

"ایک نیا معاشرہ جنم لے رہا ہے جس کا بین الاقوامی اصول امن ہوگا کیونکہ اس کے ملکی حکمران ہر جگہ ایک جیسے ہوں گے ـــ محنت کش"

عظیم لینن نے کارل مارکس کی تعلیمات کی روشنی میں روس میں انقلاب برپا کیا اور دنیا کی پہلی اشتراکی ریاست قائم کی۔ اس انقلاب نے صدیوں کی جمی ہوئی استحصالی برف کو پگھلا دیا۔ انقلاب کا دہانہ کھول دیا۔ اور دوسری قوموں کو آزادی کا راستہ دکھایا۔ لینن نے سوویت یونین کی خارجہ پالیسی کی بنیاد "امن، مساوات، قوموں کے حق خود مختاری، تمام ممالک کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کے احترام" کے اصولوں پر رکھی۔ اس نے کہا سوویت یونین پوری دنیا کے عوام کے مابین امن، سلامتی، دوستی کے رشتوں کو استوار کرنے کی کوشش کرتی رہے گی اور "امن" کا مقصد عوام میں سامراجیوں اور سرمایہ داروں کے خلاف نفرت پھیلانا اور سامراجیوں کو عوام سے کاٹ کر تنہا اور بے مددگار چھوڑنا ہے۔

ان ہی نظریات کی روشنی میں ۳ دسمبر ۱۹۱۷ء کو لینن اور اسٹالن نے ایک پیغام میں روس اور مشرق کے مسلم محنت کشوں کو مژدہ سنایا کہ "ایران کی تقسیم کا معاہدہ کالعدم کیا جاتا ہے۔ روسی فوجوں کو جلد واپس بلا لیا جائے گا۔ ترکی کی تقسیم کا معاہدہ منسوخ کیا جاتا ہے۔ آرمینا اُسے واپس دیا جاتا ہے آرمینا کے عوام آزادانہ اور بلا خوف وخطر اپنا حق خود مختاری استعمال کرنے کی اجازت دی جاتی ہے"۔

اور یہ لینن ہی تھا جس نے اس وقت افغانستان سے سفارتی تعلقات قائم کئے اور اس کی آزادی، خود مختاری اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا جب برطانوی سامراج افغانستان کو ہڑپ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان ہی اصولوں پر ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کو ترکی اور ۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء کو جرمنی سے معاہدے کئے۔

لینن کے بعد اسٹالن برسر اقتدار آیا۔ وہ سچا اور کٹر مارکسی لیننی تھا۔ اس کی خارجہ پالیسی لینن کے متعین کردہ اصولوں پر مبنی تھی۔ اس نے ۲۹ نومبر ۱۹۳۲ء کو فرانس سے "امن" اور "غیر جارحانہ" معاہدہ کیا۔ جنگ عظیم دوم شروع ہوئی تو اسٹالن نے نازی جرمنی سے معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ کرتے وقت اسٹالن نے نازی جرمنی کے جارحانہ اقدامات کو نظر انداز کر دیا۔ وہ بھول گیا کہ نازی جرمنی دوسری قوموں کی آزادی، خود مختاری اور اقتدار اعلیٰ کو پامال کر رہا ہے۔ اس معاہدہ کا یہ جواز پیش کیا جا سکتا ہے کہ اسٹالن جو سوویت یونین میں مصروف تھا، جنگ

معاہدہ وارسا کی سب سے
بڑی پارٹی' روس نے
دوسرے چھوٹے ممالک
پر تسلّط جمالیا

کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہ جواز درست نہیں۔ اشتراکی نظریات کے اعتبار سے جارح طاقت سے معاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال یہ بڑے آدمی کی بڑی غلطی تھی اور اسٹالن نے اس غلطی کا خمیازہ یوں ادا کیا کہ فاشزم کے خلاف اس نے برطانیہ، امریکہ اور فرانس سے اتحاد کیا۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۱ء کو لندن میں اتحادیوں کی کانفرنس میں روسی وفد شریک ہوا۔ جس کے نتیجہ میں ۲۶ مئی ۱۹۴۲ء کو برطانیہ اور روس کے درمیان فاشزم کے خلاف معاہدہ ہوا۔ تاکہ دنیا کو شیطانیت کے چنگل سے بچایا جائے۔

اسٹالن کے بعد روس میں ترمیم پسند ٹولہ برسر اقتدار آ گیا۔ اس نے اشتراکیت سے انحراف کرتے ہوئے ترمیم پسندانہ پالیسی اختیار کی اور آہستہ آہستہ روس اشتراکیت سے دور ہوتا چلا گیا۔ سرمایہ داری بحال ہونے لگی۔ اس کا اثر خارجہ پالیسی پر بھی ہوا۔ کیونکہ لینن نے کہا تھا "روس کی خارجہ پالیسی اس کی داخلہ پالیسی سے متعین کی جاتی ہے"۔ حکمران طبقہ نے بین الاقوامی اشتراکیت کے روپ میں مشرقی یورپ کی اشتراکی ریاستوں کو اپنی "جدید نوآبادیاتی ریاستوں" میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ البانیہ، بلغاریہ، چیکو سلواکیہ، ہنگری، پولینڈ سے "دوستی، تعاون اور باہمی امداد" کا معاہدہ ۱۴ مئی ۱۹۵۵ء میں کیا جو "معاہدہ وارسا" کہلاتا ہے۔ اس میں کہا گیا کہ اس معاہدے کا مقصد آزادی، اقتدار اعلیٰ کے احترام اور ریاستوں کے جمہوری امور میں عدم مداخلت کے اصولوں پر دوستی، تعاون اور باہمی امداد کو ترقی دینا ہے معاہدہ وارسا کی اہم دفعات یہ ہیں۔

دفعہ نمبر ۲۔ معاہدے میں شریک تمام فریقین اعلان کرتے ہیں کہ وہ عالمی امن اور سلامتی کے معاملے میں سنجیدہ ہیں اور وہ اس سلسلے کے تمام اقدامات اور کوششوں سے تعاون کریں گے۔

دفعہ نمبر ۳۔ اگر ایک فریق کو مسلح جارحانہ حملہ کا خطرہ ہو یا اگر وہ محسوس کرے کہ معاہدے میں شریک کسی فریق یا فریقین کو مسلح حملہ کا خطرہ ہے تو فوراً فریقین سے رابطہ قائم کرے۔ اور صلاح مشورے کریں تاکہ مشترکہ دفاع کے ذریعے امن اور سلامتی کو برقرار رکھا جا سکے۔

دفعہ نمبر ۴۔ اگر معاہدے میں شریک ایک فریق یا فریقین پر مسلح حملہ ہو تو اقوام متحدہ کے چارٹر ۵۱ کے تحت کسی بھی فریق کو انفرادی یا اجتماعی طور پر دفاع کرنے کا اختیار حاصل ہوگا اور اس سلسلے میں وہ اپنی مسلح افواج بھی استعمال کر سکتا ہے۔۔۔۔

دفعہ نمبر ۵۔ تمام فریقین اس بات پر راضی ہیں

روس نے چین پر سولہ جارحانہ حملے کئے ہیں

کہ ایک مشترکہ دفاعی کمان بنائی جائے جس میں فریقین کی مسلح افواج کا ایک حصّہ شامل ہو۔ یہ مشترکہ دفاعی کمان، مشترکہ دفاع کے مروّجہ اصولوں کے تحت کام کرے گی.....

اس معاہدے میں سب سے بڑی پارٹی ہونے کی وجہ سے سوویت یونین نے معاہدے میں شریک دوسرے چھوٹے ممالک پر اپنا تسلط جما لیا۔ روسی حکمران فروری ۱۹۵۶ء میں ہونے والی روسی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس کے بعد ہی سے ترمیم پسندانہ راہ عمل اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مشرقی یورپ کی اشتراکی ریاستوں کو اپنی نوآبادیات سمجھتے ہوئے استحصال شروع کر دیا۔ تجارت اور امداد کی شرائط کچھ اس طرح مرتب کیں کہ توازن تجارت ہمیشہ روس کے ہی حق میں رہا۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء میں البانیہ نے روسی بلاک اور معاہدۂ وارسا سے علیحدگی اختیار کر لی اور پیکنگ کا حامی ہو گیا۔ ۱۹۶۶ء میں رومانیہ نے بھی روسی تعاون اور امداد پر انحصار کرنا چھوڑ دیا۔

چیکوسلواکیہ میں ترمیم پسند قیادت کے خلاف عوامی اُبھار پیدا ہوا۔ عوام نے سوویت یونین کے استحصال اور بالادستی کے خلاف آواز اٹھائی۔ حکمران طبقہ پہلے پہل تو عوامی مطالبے کو دباتا رہا۔ لیکن آخرکار مجبوراً اُسے اصلاحات کی طرف قدم اُٹھانا پڑا۔ چیکوسلواکیہ کو بھی اپنے جال سے نکلتا دیکھ کر سوویت یونین نے چیکوسلواکیہ کے غدّار حکمرانوں کے گٹھ جوڑ سے اپنی مسلّح افواج پراگ بھیج دیں۔ معاہدہ وارسا کی آڑ لے کر روسی حکمرانوں نے چیک عوام کا قتل عام کیا۔ ۲۰ اگست ۱۹۶۸ء کو رات کی تاریکی میں روسی فوجوں نے پراگ پر حملہ کر دیا۔ سنگینوں اور توپوں کا کھُلے عام استعمال کیا اور فسطائی طریقوں سے عوام کو کچلا۔ روسی فوجوں نے چیکوسلواکیہ کے ترمیم پسند حکمران ڈوبچیک کو زیرِ حراست ماسکو بھیج دیا جہاں انہوں نے سوویت یونین کی اطاعت قبول کر لی۔ اور اس طرح اپنے عوام کو دھوکا دیا۔ لیکن چیک عوام نے "سوویت چیکوسلاویک مذاکرات" کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور روسی فوجوں سے مزاحمت کی۔ پراگ کی سڑکوں، گلیوں اور کوچوں میں ڈوبچیک ٹوٹے اور سوویت حکمرانوں کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے۔ چیکوسلواکیہ میں روس کی مداخلت، ہٹلر کی جارحیت، ویت نام میں امریکی سامراج کی جارحیت کے بالکل مترادف ہے۔ دراصل چیکوسلواکیہ کے واقعہ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ سوویت ترمیم پسند حکمران سوشل سامراجیوں اور سوشل فسطائیوں کے رُوپ میں ڈھل چکے ہیں۔

روس کے نئے زاروں کے توسیع پسندانہ عزائم خطرناک حد تک بڑھ چکے ہیں۔ اب یہ عوامی جمہوریہ چین کے علاقوں پر بھی نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ مارچ ۱۹۶۹ء میں دو بڑے جارحانہ حملے کئے۔ اب تک روس چین کے علاقے پر سولہ مرتبہ مسلح مداخلت کر چکا ہے۔ دراصل روس سنکیانگ اور دریائے اسوری کے جزیرے "چن پاؤ" پر دانت لگائے ہوئے ہے۔ چن پاؤ جسے روسی "دامنسکی" کے نام سے پکارتے ہیں صرف ایک مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس جزیرے کو حاصل کرنے کے لئے روس متعدد بار مسلح مداخلت کر چکا ہے۔ حالانکہ چین نے ہر مرتبہ تصادم سے بچنے کی کوشش کی ہے۔

عوامی جمہوریہ چین نے کوئی چھ سات سال قبل سوویت یونین کے حکمرانوں کو ایک نقشہ دکھایا اور بتایا کہ سوا سو سال پہلے زار روس نے دباؤ ڈال کر چین کے وسیع علاقے ہڑپ کر لئے تھے جو اب طے ہو جانے چاہئیں۔ سوویت یونین نے چین کے اس اقدام پر اعتراض کیا تو چین نے جوابی مراسلے میں روس کے اس شک کو کہ چین جنگ کرنا چاہتا ہے دُور کرتے ہوئے لکھا:

"اگرچہ چین اور روس کی سرحد سے تعلق رکھنے والے پرانے معاہدات غیر مساوی معاہدے تھے، اس کے باوجود چینی حکومت نہ صرف ان کا احترام کرنے پر رضامند ہے بلکہ انہیں سرحدی مسئلہ کے مناسب تصفیے کی بنیاد بنانے کو بھی تیار ہے۔ اگر سوویت یونین بھی چینی حکومت کی طرح دوستانہ اور تعاون کا رویہ اختیار کرے تو ہمارے نزدیک چین اور روس کے سرحدی مسئلے کا تصفیہ مشکل نہ ہو گا۔"

لیکن روس نے اس کا جواب مسلح مداخلت سے دیا۔ اس لئے مجبوراً "دو پیپلز ڈیلی" کو روس کے توسیع پسندانہ عزائم کا پردہ چاک کرتے ہوئے لکھنا پڑا:

"سوویت یونین کے رہنما منگولیا (منگولیا قدیم چین کا ایک حصّہ تھا) کو صرف نوآبادی بنانے پر قانع نہیں ہیں۔ بلکہ وہ توسیع پسندی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اور ایسے بعض علاقے جو صدیوں سے چین کا حصّہ سمجھے جاتے ہیں انہیں ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ روسی ترمیم پسند منگولیا کے مظلوم عوام پر اسی طرح ظلم ڈھا رہے ہیں جس طرح امریکی سامراج نیگروز کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا ہے۔"

سوویت یونین کے رہنماؤں کا عالمی تسلط کے لئے امریکی سامراج سے گٹھ جوڑ، گلاسبرو کے مذاکرات، ویت نام، مشرق وسطیٰ، لاطینی امریکہ میں امریکی سامراج سے گٹھ جوڑ، ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی روک تھام اور دیگر مسائل پر سامراج سے سودے بازیاں، چیکوسلواکیہ میں مسلّح جارحیّت، عوامی جمہوریہ چین کے علاقوں میں مسلّح مداخلت، اور بھارتی حکمرانوں سے حالیہ دفاعی معاہدہ اس کا مکمل ثبوت ہے کہ کارل مارکس، اینگلز اور لینن کے یہ نام نہاد پیروکار، مارکسزم اور لینن ازم کو ترک کر چکے ہیں۔ انقلاب اور بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے راہ عمل سے غدّاری کر رہے ہیں اور یہ ان صفوں میں شامل ہو گئے ہیں جو اپنے بزرگوں اور رہنماؤں کے نام پر استحصال کرتے ہیں۔

روسی سوشل سامراج پاکستان پر ایک اور جنگ ٹھونپنا چاہتا ہے۔ اس نے تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ بھارت کو مسلّح کر رہا ہے۔ ہمیں بھی تیاریاں کر لینی چاہئیں۔ جب تک سرمایہ دارانہ اور استحصالی نظام برقرار ہے جنگ کا خطرہ موجود رہے گا۔ خواہ کوئی امن کے کتنے ہی گیت کیوں نہ گائے۔ جنگ کے خاتمہ کا واحد حل صرف اور صرف انقلاب ہے۔ چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا ہے "ایک نئی عالمی جنگ کا خطرہ اب بھی موجود ہے۔ تمام ممالک کے عوام کو اس کے خلاف تیاریاں کرنی چاہئیں۔ تاہم اس وقت دنیا کا رجحان انقلاب کی جانب ہے۔"



پاکستان میں الجزائر کے سفیر مسٹر احمد توفیق المدنی، الجزائر کے وزیر خارجہ مسٹر بوتفلیقہ کا بوسہ لیکر خیر مقدم کر رہے ہیں (تصویر: الفتح)

الجزائر کے وزیرِ خارجہ
کے خیر مقدم کے لئے
کراچی ایئرپورٹ پر
پاکستان کی کوئی اہم
شخصیت نہیں آئی

الجزائر کے جواں سال انقلابی، چین، کوریا اور ویت نام کے انقلابیوں کے درمیان

۱۴ اگست کو بہادر عوام کے مُلک الجزائر کے سفیر جناب احمد توفیق المدنی ہلال ہسپتال میں مسٹر بھٹو کی مزاج پُرسی کے لئے آئے تو اُن سے میری تنہائی میں خاصی تفصیلی ملاقات رہی۔ ان کے ذریعے ہی مجھے معلوم ہوا کہ اتوار ۱۵ اگست کی صبح الجزائر کے وزیر خارجہ جناب عبدالعزیز بوتفلیقہ ویت نام چین اور کوریا کے دورے سے وطن واپس جاتے ہوئے کراچی ایئرپورٹ پر کچھ دیر قیام کریں گے۔ میں صبح سویرے سات بجے ایئرپورٹ پر جا پہنچا وہاں وزیر خارجہ کے استقبال کے لئے پاکستان میں الجزائر کے سفیر، کراچی میں چین کے قونصلر، کوریا کے قونصلر بھی موجود تھے۔ کوئی پاکستانی صحافی اور حکومت پاکستان کا کوئی خاص نمائندہ موجود نہ تھا۔ ایک افسر مہمانداری تھے۔ جو عام غیر ملکی سفیروں وغیرہ کی آمد پر بھی نظر آیا کرتے ہیں۔ جانے الجزائر کے وزیر خارجہ کو اہم شخصیت کیوں نہ سمجھا گیا۔ پی آئی اور اے پی پی والے جو ہر کس و ناکس کو ملنے وی آئی پی لاؤنج میں پہنچ جاتے ہیں، وہ تھے نہ کراچی کی انتظامیہ سے کوئی حالانکہ الجزائر کے وزیر خارجہ ایک نہایت اہم دورے سے واپس آرہے تھے۔ اگر حکومت پاکستان کا کوئی نمائندہ ان سے ملتا اور موجودہ صورت حال پر ان کا سفارتی تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی۔

پی آئی اے کا طیارہ رُکا اور اس سے وزیر خارجہ اپنے وفد کے ارکان کے ساتھ باہر آئے تو الجزائر کے سفیر نے روایتی عرب انداز میں ان کا بوسہ لے کر خیر مقدم کیا۔ کوریا اور چین کے قونصلر نے ان کا استقبال کیا۔ وی آئی پی لاؤنج میں میں نے ان سے ویت نام، کوریا اور چین کے دورے کے تاثرات جاننا چاہے تو انہوں نے انکار کیا اور پاکستان میں الجزائری سفارت خانے کی مترجم آنسہ ثروت حسین کے ذریعے بتایا کہ وہ اپنے وطن جاکر اپنی حکومت سے بات چیت کرکے اس دورے کے سلسلے میں رپورٹ پیش کریں گے انہوں نے البتہ پاکستان میں اپنے دو گھنٹے کے مختصر سے قیام پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ مناسب موقع ملنے پر میں پاکستان کا دورہ بھی کروں گا۔

ایک انقلابی ملک اور مسلسل سات برس تک جنگ آزادی لڑنے والی قوم کے وزیر خارجہ تین ایسے انقلابی ملکوں کے دورے پر گئے تھے۔ جن میں سے دو سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اب خود کفالت کی منزل حاصل کر رہے ہیں۔ جہاں کے عوام کی محنت اور لگن دوسرے ملکوں کے لئے مثال بن چکی ہے اور ایک ملک شمالی ویت نام



الجزائر کے وزیر خارجہ بوتفلیقہ اپنے وفد کے ارکان کے ساتھ کراچی ایرپورٹ پر (فوٹو الفتح)

پاکستان کے عوام خود اپنے بُحران کا حل تلاش کریں گے

اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے - اس دورے کی اہمیت کے پیش نظر الجزائری وزیر خارجہ کے وفد میں فوجی شخصیتیں بھی تھیں، ڈپلومیٹ بھی، اقتصادی امور کے ماہرین بھی - ان کا وفد ۲۲ ارکان پر مشتمل تھا -

۱- مسٹر عبدالعزیز بوتفلیقہ وزیر خارجہ
۲- مسٹر بن جیلس عبدالملک گشتی سفیر
۳- مسٹر عمر الصدق - گشتی سفیر
۴- مسٹر آیت شالار - گشتی سفیر
۵- مسٹر عبدالحمید اوجالی - گشتی سفیر
۶- میجر عبدالرحیم برّی افواج کے ایک علاقے کے کمانڈر
۷- لیفٹیننٹ رشید - فضائی افواج کے ایک علاقے کے کمانڈر
۸- مسٹر حسین الجری - مشیر
۹- مسٹر عبدالقادر بوفاصی - وزارت خارجہ کے عربی شعبے کے سربراہ
۱۰- مسٹر لبشیر الرّوس - وزارت خارجہ کے اقتصادی شعبے کے سربراہ
۱۱- مسٹر محمد عبدالسعید - مشیر
۱۲- مسٹر نجیب بدری - وفد کے سیکرٹری
۱۳- مسٹر نائت ساتری نوقردین - ڈائریکٹر روزنامہ المجاہد
۱۴- مسٹر ملک بن حسین "ریوولشینا افریقانا" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر
۱۵- مسٹر عثمان عامر - ریڈیو ٹیلی وثرن کے نیوز ایڈیٹر اور مبصر
۱۶- مسٹر حسن بوعلیم - ریڈیو - ٹی وی رپورٹر
۱۷- مسٹر سعید امیر - ریڈیو ٹی وی رپورٹر
۱۸- مسٹر عمر بونصاشہ -

باقی چار افراد کا سفارتی سروس سے تعلق تھا -

۲۲ ارکان پر مشتمل یہ وفد ۱۸ جولائی ۱۹۷۱ء کو اپنے وطن سے روانہ ہوا تھا - اس نے بارہ روز تک چین کا دورہ کیا اور ایک ایک ہفتہ ویت نام اور کوریا میں گزارا - تینوں انقلابی ملکوں کے بڑے بڑے شہروں پیکنگ شنگھائی، سینان، ہانگ چو، عذین، کہنوا، ہنوئی وغیرہ میں وہ انقلابی عوام سے ملے -

میں نے اس وفد کے ایک رکن اور الجزائری وزارت خارجہ کے اقتصادی شعبے کے سربراہ مسٹر لبشیر الرّوس سے اپنے تعارف کے بعد اس دورے کی تفصیلات جاننے کی خواہش کا اظہار کیا اور بتایا کہ ہمارا پرچہ بھی جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور سامراج کے خلاف انقلابی جدوجہد کا قائل ہے اور اس کا نام بھی فلسطین کی تنظیم "الفتح" کے نام پر رکھا گیا ہے - انہوں نے بڑی خوشی ظاہر کی اور تپاک سے ملے - مجھے اپنے ساتھیوں کے نام بتائے اور پھر کہا کہ ہمارا یہ دورہ انتہائی کامیاب دورہ رہا ہے - ہم نے تینوں انقلابی ممالک کے اولوالعزم عوام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا - ان کی جدوجہد یقیناً رنگ لائیگی خاص طور پر ویت نامی قوم کی جدوجہد سے تو ایک نئی عظیم تہذیب اُبھر رہی ہے - ایسی تہذیب جو ایشیا اور افریقہ پر چھا جائے گی -

ریڈیو کے نیوز ایڈیٹر مسٹر عثمان امیر نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا کہ ہم ایک اسلامی ملک کے باشندے ہیں - ہمارا مذہب انتہائی انقلابی مذہب ہے - ہم نہایت سچے دل سے سمجھتے ہیں کہ انقلاب اور اسلام کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے - اسلام تاریخ کے موڑ پر خود ایک انقلاب کے طور پر آیا تھا - ممکن ہے کہ بعض مسلمان اس سے گریز کریں اور رجعت پسند بنے اور اسلام کو رجعت پسند ثابت کرنے کی

پی - آئی - اے کی "مہمان نوازی"

الجزائر کے وزیر خارجہ نے پی - آئی اے کو یہ شرف بخشا کہ واپسی کا سفر پی آئی اے کے ذریعے کراچی تک اور پھر کراچی سے پیرس تک کیا - لیکن پی آئی اے نے اس کا جواب اس مہمان نوازی سے دیا کہ اس سرکاری وفد کے سامان کی بھی چیکنگ کی اور وفد کے ایک رکن کے بیگ کی کچھ اس طرح چیکنگ کی کہ اس کی زنجیر توڑ ڈالی - وہ صاحب بے چارے سخت پریشان تھے کیونکہ بیگ بند نہیں ہو رہا تھا - اور اسے وہ اپنے ساتھ کیبن میں رکھ نہیں سکتے تھے - خیال رہے کہ آجکل مسافروں کے سامان کی چیکنگ ان کی عدم موجودگی میں کی جاتی ہے ایسے ڈپلومیٹک وفد عام طور پر اس چیکنگ کی زد میں نہیں آتے -



پاکستان میں الجزائر کے سفیر۔ انکی سیکرٹری مس ثروت حسین الجزائر کے وزیر خارجہ کا خیر مقدم کر رہے ہیں (فوٹو الفتح)

کوشش کریں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے" مسٹر بشیر نے کہا کہ "حضور اکرم اور ان کے صحابہ بھی ایک حقیقی انقلاب لائے تھے اور سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ صحابہ کرام پرولتاری طبقے سے تعلق رکھتے تھے وہ منکسرالمزاج تھے۔ سادگی سے محبت رکھتے تھے۔ ان کی زندگی میں تکبّر اور ڈکٹیٹری نظر نہیں آتے تھے۔ ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا۔"

اس ضمنی بات چیت کے بعد انہوں نے ویت نام کے عوام کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ "ہم ویت نام کی انقلابی جدوجہد سے پہلے ہی متاثر تھے۔ لیکن ہم نے اپنی آنکھوں سے انہیں جدوجہد میں مصروف دیکھ کر فخر محسوس کیا۔ وہ گزشتہ بیس سال سے سامراج کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں۔ جنگ کی تمام تر تباہ کاریوں کے باوجود ہم نے ویت نام کے عوام میں زندگی کے وہی جذبات اور معمولات دیکھے جو کسی بھی زمانہ امن میں رہنے والی دوسری قوم میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ ویت نام کے عوام کے لئے جنگ معمول بن چکی ہے اور وہ اس سے خوفزدہ نہیں ہیں۔ جنگ نے انہیں برہم مزاج نہیں بنا دیا۔ زندگی کے معمولات بھی جاری ہیں اور سامراج سے جنگ بھی۔ ان کا عزم یہ ہے کہ وہ اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک فتح حاصل نہیں ہو جاتی۔ ان کے چہروں پر تھکن کے آثار نہیں ہیں۔ ان کے جسم نڈھال نہیں ہیں۔"

سات سال تک مسلسل جنگ آزادی لڑنے والی الجزائری قوم کے ایک فرد سے ایک دوسری حریت پسند قوم کے لئے احترام کے یہ جذبات مجھے انقلابی تاریخ کا ایک اہم باب محسوس ہو رہے تھے وہ جذبات کی رو میں بہہ رہے تھے۔ میں ہمہ تن گوش تھا: "ہم ان کے بلند عزم سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ بلند عزم جس سے سرشار ویت نامی عوام بہت بڑے دشمن کے خلاف صف آرا ہیں اور یہ عزم اس وقت تک کے لئے ہے جب تک کہ انہیں فتح نصیب نہیں ہو جاتی۔"

ویت نام کے انقلابی عوام کے لئے سراپا احترام بنے ہوئے انقلابی الجزائری نوجوان سے میں نے شمالی کوریا کے دورے کے سلسلے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ "انہوں نے بے پناہ ترقی کی ہے جاپانیوں کی غلامی کے دور میں ان کی شہری زندگی اور معیشت بالکل تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ شہر برباد ہو گئے تھے۔ اب ان کے شہر جدید ترین شہروں جیسے ہیں۔ ان کی گلیاں اور سڑکیں، نیویارک اور پیرس کی گلیوں اور سڑکوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ بلکہ ہمیں تو ان کی گلیاں اور سڑکیں، پیرس کی گلیوں اور سڑکوں سے زیادہ صاف نظر آئیں۔ وہ لوگ اپنے شہروں کی طرف بہت توجہ دے رہے ہیں۔ ہم نے کوریا میں صنعتی تنصیبات بھی دیکھیں۔ کارخانوں نے تو ہمیں بہت متاثر کیا۔ کیونکہ شمالی کوریا نے ۲۰ برس پہلے بالکل کچھ نہ ہونے سے سفر کا آغاز کیا تھا۔

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیں



پاکستان میں چین کے قونصلر۔ الجزائر کے وزیر خارجہ کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ (فوٹو الفتح)

سنو! آواز آرہی ہے

مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

سامع

سُنو آواز آرہی ہے

سنو! یہ آواز صدیوں سے پنج وقت بلند ہوتی چلی آرہی ہے

سُنو! یہ آواز

اَللہ بہت بڑا ہے

اللہ بہت بڑا ہے

اللہ بہت بڑا ہے

اللہ بہت بڑا ہے

میں گواہی دیتا ہوں، نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔

میں گواہی دیتا ہُوں، نہیں کوئی معبُود سوائے اللہ کے۔

میں گواہی دیتا ہوں، محمدؐ اللہ کے رسول ہیں

میں گواہی دیتا ہوں محمدؐ اللہ کے رسول ہیں

آؤ۔ طرف نماز کے

آؤ۔ طرف نماز کے

آؤ۔ طرف فلاح کے

آؤ طرف فلاح کے

اللہ بہت بڑا ہے

اللہ بہت بڑا ہے

نہیں معبُود کوئی سوائے اللہ کے"

سنو! یہی سب سے پہلی آواز تھی جو ہم سب نے اپنی ماں کے پیٹ سے باہر آتے ہی سُنی تھی۔

کوہِ صفا سے خیر الامم ؐ نے آخری بار اس آواز پر صاد کیا اور فرمایا:

"خوب سُن لو کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو پنجگانہ نماز ادا کرو۔"

اور ایک حبشی غلام کی اس آواز پر بڑے بڑے لوگ مسجد میں سر جھکاتے چلے آتے تھے۔ امیر بھی، غریب بھی۔ غلام بھی، آقا بھی۔ اور سامع نے مسجد میں پنج وقت صف بندی میں طبقاتی امتیاز کو خوف الٰہی سے لرزتے ہُوتے زمین بوس دیکھا

سامع نے ایسے معاشرے کا بھی نظارہ کیا جس میں نہ نماز گزار آقاؤں کو غلاموں پر سبقت ملی اور نہ ہی "احساسِ محرومی" غلاموں کا مقدر بنا۔ اور نہ ہی کالا گورے پر افضل آیا۔ اور نہ ہی گورا کالے پر مقدم ٹھہرا۔

سُنو!

اس آواز پر ذہن آزاد ہُوتے، فکرِ انساں کو جلا ملی، سینے منوّر ہوئے، مسجد میں طبقاتی امتیاز مٹانے کا حرف آغاز نہیں۔ یہ پہلی دانستہ سعی تھی جس سے قول و فعل میں یگانگت کا رنگ بھرنا شروع ہُوا، یہ پہلا قدم تھا جس میں انسانی جذبۂ اخوت کو اُبھارا گیا۔ اور انسان کو انسان کے کام آنے کی تلقین کی گئی۔ ہر دامنِ تار تار کو خبر ہوئی۔

سنو! اس پنج وقتہ آواز پر آقا نے بھی لبیک کہی اور غلام نے بھی، امیر بھی غریب کے شانہ بشانہ کھڑا ہوا تاکہ ایک دوسرے کے درد کا احساس اجاگر ہو، دکھ بانٹنے کا جذبہ پیدا ہو اور حاجتمندوں کی حاجت روائی کا دوسرے ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے

سنو! یہ آواز ایک دوسرے کو قریب لانے اور ایک دوسرے کے دل میں جھانکنے کے لئے بلاتی ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ اطاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

سنو! یہ آواز معاشرتی یگانگت کی طرف بلاتی ہے۔ یہ آواز انسانی فلاح کا سبق ہے۔

سنو! یہ آواز۔ ایک ایسے معاشرے کی تحریک تھی اور تحریک ہے۔ جہاں انسانوں کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں ہوتی، جہاں اشرف المخلوقات ایک ہی سطح اور ایک ہی صف میں جمع ہوتے ہیں۔ جہاں کوئی اس آواز پر لبیک کہنے والوں میں مسجد کے اندر اور مسجد کے باہر بڑا اور کوئی چھوٹا نہیں ہوتا۔

سامع کے کانوں میں اس آواز کی گونج اب بھی آرہی ہے۔ لیکن وہ مجسمۂ حیرت بنا اب یہ نوحہ بھی سن رہا ہے۔ ع

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے۔

کیونکہ ملّاں کی اذاں اور مجاہد کی اذان اور

سنو! بہروپ نے اس آواز کے پیدا کئے ہوئے جذبہ اخوت کو سرد کر دیا۔ اور طبقاتی امتیاز کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا اور درس یگانگت کو مسجدوں کے باہر گوارا نہ کیا۔ مسجدیں ایسے نمازیوں سے خالی ہوتی چلی گئیں۔ جن کے دل میں خوف الٰہی بھی تھا۔ اور انسانیت کا درد بھی

سنو! سامع آج مجسمۂ حیرت بنا مسجدوں کے گرد و پیش انسانوں کو سوالی بنا دیکھتا ہے۔ اس آواز پر آنے والے انسان۔ اب ان انسانوں کے دلوں میں نہیں جھانکتے کہ ان کے ہاتھ کیوں دراز ہیں؟ سامع حیران ہے کہ مسجد کے اندر جمع ہو کر ایک دوسرے کا درد بانٹنے والے اب اس امتیاز کا شکار کیوں ہو گئے۔ مسجد کے باہر کھڑے ہونے والے کو اندر جانے کی جراُت کیوں نہیں ہوتی۔ مسجد میں جہاں طبقاتی امتیاز خوف الٰہی سے لرزتے ہوئے زمین بوس ہو جاتا تھا۔ اب ان کے گرد و پیش طبقاتی امتیاز اور احساس محرومی کی نشاندہی کیوں کرتے ہیں۔

سامع کے کانوں میں صدا کی گونج اب بھی آرہی ہے۔

"دیکھو جو لوگ موجود ہیں، وہ ان لوگوں کو جو موجود نہیں ہیں۔ ان کی تبلیغ کرتے رہیں، ممکن ہے بعض سامعین اس کلام کو یاد رکھنے اور حفاظت کرنے والے ہوں جن پر تبلیغ کی جائے۔"

سنو! مسجدوں کے مینار جھک جھک کر سوال کرتے ہیں۔ منبر و محراب کے وارثوں سے کہ انہوں نے اس پنج وقتہ آواز پر جمع ہونے والوں کے مسائل جاننے کی کوشش کی۔ کیا انہوں نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر درد محسوس کرنے کی کوشش کی۔ کیا ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرنے کی کوشش کی جس میں ان سر جھکانے والوں کے بچے اپنے سینے روشن کر سکیں، جہاں بیماروں کو شفا مل سکے، جہاں حاجتمندوں کی حاجت روائی ہو سکے!

سنو! سامع پوچھ رہا ہے "کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے"۔

الفتح

عوام کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟

انجکشن جعلی نہ ہوتا تو غریب شبیر علی کا بچّہ بچ جاتا



نعیم آروی

شبیر علی کورنگی میں رہتا ہے۔ چند ماہ پیشتر اس کا بچہ سخت بیمار پڑ گیا۔ ایک رات بچے کی حالت تشویشناک ہو گئی۔ بھاگ دوڑ کے بعد۔ ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر دستیاب ہوئے۔ انہوں نے بچے کے طبّی معائنہ کے بعد ایک انجکشن دیا۔ اور شبیر علی کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "اللہ پر بھروسہ رکھو، اس انجکشن سے آفاقہ کی پوری امّید ہے۔" پندرہ منٹ گزر گئے مگر افاقے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ بچّے کی حالت بگڑتی گئی۔ ڈاکٹر صاحب پریشان تھے۔ شبیر علی کے ہاتھ پاؤں سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ ماں کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا گھڑی کی سوئی پوری رفتار سے ٹک ٹک کرتی آگے بھاگ رہی تھی۔ بچہ کی حالت سنگین ہو گئی۔ ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا "سمجھ میں نہیں آتا بچہ پر انجکشن کا اثر کیوں نہیں ہوا۔ حیرت ہے۔ میں نے جو انجکشن لگایا ہے، وہ وقتی افاقہ کے لئے جواب نہیں رکھتا۔" چند منٹوں کے بعد ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے شبیر علی سے کہا۔ "میرے اختیار سے باہر ہے۔ بچہ کو جلدی اسپتال لے جاؤ۔"

مل مزدور شبیر علی اپنے بچے کو بچانے کے لئے آخری حد تک جد و جہد کرتا رہا۔ مگر موت کو ٹالنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ صبح ہوتے ہوتے اس کا پیارا بچہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے انجکشن کی خالی شیشی کیمیاوی تجزیہ کے لئے سرکاری لیبارٹری بھیج دی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں رپورٹ آ گئی جس سے نقلی انجکشن کی قلعی کھل گئی۔ اگر انجکشن اصلی کمپنی کا ہوتا تو شاید شبیر علی کا بچہ بچ جاتا۔ ڈاکٹر نے جب اس بات کا انکشاف کیا تو شبیر علی کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ گئے۔ "پروردگار جو لوگ پیسے کی لالچ میں ایسا جعلی اور گھناؤنا کاروبار کرتے ہیں۔ انہیں میرا درد بخش دے۔"

کراچی میں اس وقت ایسی کئی جعلی کمپنیاں نقلی ادویات تیار کر کے انسانی جانوں سے کھیل رہی ہیں۔ اس وقت کم سے کم دس ڈسٹلریز DISTA-LARIES زیر زمین غیر قانونی طریقے سے کام کر رہی ہیں جن میں معروف انجکشنوں کے نام پر نقلی انجکشن تیار ہوتے ہیں۔ نقلی انجکشن میں پانی کا مقدار تناسب سے کہیں زیادہ ہوتا ہے انہیں سند یافتہ کمپنیوں کے تیار کردہ انجکشن اور ادویات کے مقابلے میں بہت کم قیمت پر مارکیٹ میں سپلائی کیا جاتا ہے۔

عوام اور کیمسٹوں کو دھوکا دینے کے لئے ان ادویات اور انجکشنوں پر معروف اور لائسنس یافتہ کمپنیوں کے نقلی لیبل بھی چسپاں کر دیئے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۹ء - ۷۰ میں ان نقلی ادویات فروشوں کے خلاف ایک زبردست مہم شروع کی گئی تھی جس میں نقلی کیمکلز فیکٹریاں پکڑی میں آئی تھیں۔ اس کی ابتدا جرمن کی ایک مشہور دوا ساز کمپنی کی شکایت پر شروع کی گئی تھی۔ نقلی دوائیں کمپنی کے لیبل سے فروخت کی جا رہی تھیں۔ قانون کی گرفت جوں ہی ڈھیلی نظر آئی، انسان کش کاروبار دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ اس طرح جعلی دوا ساز کمپنیوں اور جعلی ڈسٹلریز کے غیر قانونی کاروبار سے ہر سال سینکڑوں افراد بے وقت موت کا لقمہ بن رہے ہیں۔

جعلی کیمیکلز، ڈسٹلریز اور دوا ساز کمپنیوں کے علاوہ اس شہر میں مختلف مصنوعات، پروڈکٹس کی کمپنیوں اور کاروباری اداروں نے بلا روک ٹوک اپنے غیر قانونی کاروبار کے جال کو پھیلا رکھا ہے اور عوام کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال کر لاکھوں روپے منتقل کئے جا رہے ہیں۔

لاہور کے ایک غیر معروف پبلشنگ ادارے نے ایک سابق صدر کی سوانح عمری شائع کی اور اس کی خوب تشہیر کرائی گئی۔ کتاب کی پبلسٹی میں جدید تکنیک کا سہارا لیا گیا۔ یہاں تک کہ لاہور کے شہری یہ باور کرنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ پبلشنگ ادارہ غیر ملکی ادارے کی ملکیت ہے۔ چند ہفتوں کے بعد اسی ادارے کی جانب سے مختلف اخبارات میں پبلسٹی افسر، کلرک، کیشئیر، ٹائپسٹ اور چوکیداروں کی فوری بھرتی کے لئے ایک لمبا چوڑا اشتہار شائع کیا گیا۔ اسامیوں سے ان کے عہدے کے مطابق سیکورٹی مانگی گئی۔ اس طرح چند دنوں میں اس پبلشنگ ادارے کے پاس زرِ ضمانت کی صورت میں تقریباً ۴۵ ہزار روپے جمع ہو گئے۔ ملازمت حاصل کرنے والے سبھی امیدواروں سے تین روز بعد ڈیوٹی پر پہنچ جانے کی ہدایت کی گئی۔ تیسرے دن ملازمت کے حصول میں دردر کی خاک چھاننے والے ملازمت ملنے کی بے اندازہ خوشیوں کو اپنے سینے میں سمیٹے جب اس پبلشنگ ادارے میں پہنچے تو ان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ پیشانی پر ٹنگا ہوا بورڈ غائب تھا۔ اطراف کے لوگوں سے پوچھ گچھ کی گئی تو معلوم ہوا کہ گذشتہ روز متعلقہ افراد اپنا تمام توبڑا اٹھا کر لے گئے۔

کہاں گئے ۔۔؟
کچھ نہیں معلوم ۔۔!
کیوں گئے ۔۔؟
اس کا بھی پتا نہیں ۔۔!

اُمیدواروں کے چہرے مایوسی سے دھندلا گئے۔

جعلی پبلشنگ ادارہ راتوں رات اپنی جگہ سے غائب تھا۔ اور اپنے ساتھ ملازمت حاصل کرنے والے سینکڑوں افراد کی سیکیورٹی بھی لے گیا۔ جانے کس طرح لوگوں نے زرِ ضمانت کے لئے روپے جمع کئے تھے۔ پولیس کو خبر کی گئی۔ جعلی پبلشنگ ادارے اور متعلقہ افراد کی جستجو میں رات دن ایک کر دیا گیا۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا کہ اس ادارے کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

لاہور کے ایک کاروباری ادارے نے کراچی کی ایک کمپنی سے کاسٹک کا سودا کیا۔ سودا لاکھوں میں ہوا تھا۔ معاہدے کی رو سے لاہور کے کاروباری ادارے

ایک پبلشنگ کا ادارہ چالیس ہزار روپے جمع کرکے غائب ہوگیا

نے کراچی کمپنی کو ۳۵ ہزار روپے کا بنک ڈرافٹ روانہ کر دیا۔ سودا طے پاتے ہوئے تین ہفتے گزر گئے۔ مگر کراچی کی کمپنی سے حسبِ وعدہ مال نہیں پہنچا۔ فوری طور پر ٹیلی گرام دیا گیا۔ اور جلد از جلد مصنوعات روانہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اس کا بھی کوئی جواب موصول نہ ہوا تو لاہور کمپنی نے اپنے ایجنٹ کو فوراً کراچی روانہ کیا۔ کراچی پہنچنے کے بعد ایجنٹ نے جو تفصیلی خبر دی، وہ لاہور کمپنی کی انتظامیہ پر بجلی بن کر گری۔ ٹیلی گرام میں لکھا تھا۔ "اس نام کی ایک کمپنی چند دنوں پہلے تک تھی۔ مگر اب اس کا کوئی وجود نہیں۔ پولیس اور متعلقہ حکام تک اس کی رپورٹ دے دی گئی۔ مگر ہنوز جعلی کمپنی کا سراغ نہیں مل سکا۔ سردست ۳۵ ہزار روپے ڈوب گئے۔"

جعلی کاروباری اداروں کی طرح پورے ملک

میں فلمی صنعت سے متعلق جعلی فلم ساز اداروں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے ملک کی نوجوان نسل اس صنعت سے مسحور ہے۔ شہرت، دولت اور عزت راتوں رات مل جاتی ہے۔ جعلی کاروبار کرنے والے نئی نسل کی اس کمزوری سے خوب واقف ہیں چنانچہ آئے دن اخبارات میں نئے چہروں کی تلاش کا اشتہار شائع کیا جاتا ہے۔ اور دلچسپی رکھنے والے مردوں اور خواتین سے بالمشافہ رابطہ قائم کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ جعلی فلم ساز اداروں کے ہاتھوں لوگ کس طرح لوٹے جاتے ہیں۔ اس کا زندہ ثبوت کراچی کی ایک نوجوان لڑکی عزیزہ بیگم ہے جس کی سرگزشت لرزہ خیز بھی ہے اور خاصا عبرت آموز بھی۔

عزیزہ بیگم، ناظم آباد کے اعلےٰ گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ فلم بینی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ سوتے جاگتے اس کے ذہن میں ایک ہی خیال رہتا کہ کسی طرح فلم لائن میں جانے کا موقع مل جائے۔ ایک دن وہ اپنی صلاحیتوں سے فلمی صنعت میں اونچا مقام حاصل کرے گی۔ انٹر کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی۔ اخبار میں ایک نئی فلم کے لئے چند نئے چہروں کی تلاش کا اشتہار شائع ہوا۔ اس نے دوسرے دن مذکورہ فلم ساز ادارے سے رابطہ قائم کیا۔ جس کا دفتر رتن تلاؤ کی ایک کاروباری عمارت میں قائم کیا گیا تھا۔ وہاں پہلے سے چند فلم زدہ لڑکے اور لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ اسکرین سے کمرے کا پارٹیشن کر دیا گیا تھا۔ اسکرین کی دوسری جانب سے مکالمے کی آواز آرہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد 'نئی فلم' کے ڈائریکٹر اپنا بال سنوارتے ہوئے ویٹنگ روم میں آئے۔ جن کا ٹسٹ ہو چکا تھا۔ ان سے ڈائریکٹر صاحب نے راز و نیاز میں کچھ باتیں کیں اور پھر انہیں چلتا کر کے دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہیں بھی پارٹیشن کی دوسری جانب لے جایا گیا اور "عاشر کاشمیری" کا مکالمہ خالص تھیٹریکل انداز میں بلوایا گیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ڈائریکٹر صاحب نے خواہشمندوں سے 'فیملی بیک گراؤنڈ' معلوم کیا۔ جن لوگوں کا فیملی بیک گراؤنڈ 'ساؤنڈ' تھا۔ انہیں دوسرے تیسرے دن کا ڈیٹ دیا گیا اور جو لوگ اپنے ساتھ محض "شوقِ جنون" لائے تھے انہیں یہ کہہ کر چلتا کر دیا گیا کہ 'سوری' آپ ہمارے معیار پر پورا نہیں اترے / اتریں۔" چونکہ عزیزہ بیگم کا فیملی بیک گراؤنڈ خاصا ساؤنڈ تھا اور وہ قبولِ صورت بھی تھی، اس لئے

ڈائریکٹر صاحب نے اُسے 'پرفیکٹ' کہہ کر روک لیا۔ عزیزہ بیگم نے بتایا کہ وہ اپنے اس شوق پر ۲۰ ہزار روپے برباد کر چکی، پھر بھی فلم نہ بنی۔ اُسے جب یقین ہو گیا کہ یہ لوگ فراڈ ہیں، اور اب اس کی عزت سے بھی کھیلنے والے ہیں تو وہ اپنے شوق پر لعنت بھیج کر گھر بیٹھ رہی۔ وہ اس بات پر خوش ہے کہ پندرہ بیس ہزار روپے تو گئے مگر روپے سے کہیں زیادہ قیمتی چیز اس کی عصمت اور خاندان کی عزت لٹنے سے بچ گئی۔

پاکستان میں مختلف نوعیت کی سینکڑوں جعلی فیکٹریاں اور نقلی تجارتی ادارے عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ ان کی سرپرستی خفیہ ہاتھ کر رہے ہیں۔ یہ ہاتھ مضبوط بھی ہیں اور ان کی پہنچ دور تک ہے۔ زیرِ زمین کام کرنے والی جعلی کمپنیوں کے علاوہ بے شمار لائسنس یافتہ کاروباری ادارے

عزیزہ بیگم نے ہیروئین بننے کے چکر میں ۲۰ ہزار روپے برباد کر دیئے

بھی حکومت سے فراڈ کر کے لاکھوں روپے کا ہیر پھیر کر رہے ہیں۔ سروے کے دوران پتا چلا کہ کراچی میں ایسی سینکڑوں تجارتی کمپنیاں اور تاجر باہر سے مال درآمد کرتے وقت کسٹم ڈیوٹی کے لاکھوں روپے بچا لیتے ہیں۔

الفتح کو خصوصی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ کراچی کے ایک تاجر نے کچھ عرصہ پہلے جرمنی سے ٹیکسٹائل کے پرزہ جات منگوائے تھے جس کی لاگت تقریباً ۵ لاکھ روپے تھی۔ لیکن جب اس کا مال پاکستان کسٹم سے باہر آیا تو اس پر صرف ۲ لاکھ کے سامان پر کسٹم ڈیوٹی لگائی گئی۔ حالانکہ اس کے مال کی لاگت ۵ لاکھ کی تھی۔ مگر پاکستان کسٹم آفس میں پہنچنے کے بعد معجزانہ طور پر اس کے سامان کی مجموعی لاگت ۵ لاکھ سے گھٹ کر ۲ لاکھ روپے کی رہ گئی۔ چنانچہ کسٹم ڈیوٹی بھی ۲ لاکھ روپے کے سامان پر لگائی گئی۔ حکومت کو دھوکا دینے والے کاروباری

اداروں کا دراصل بیرونی کمپنیوں اور کاروباری اداروں سے "انڈر ہینڈ ڈیلنگ" ہوتا ہے۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق مطلوبہ مقدار اور تعداد میں سامان سپلائی کیا جاتا ہے مگر ان کی قیمت اصل سے نصف بتائی جاتی ہے۔ اور اصل قیمت کا نصف حصہ غیر ملکی زرمبادلہ کی صورت میں ادا کر دیا جاتا ہے۔ جو وہاں کے بنکوں میں جمع رہتا ہے۔ ادھر پانچ لاکھ روپے کا سامان ۲ لاکھ روپے میں تبدیل ہو کر کسٹم آفس پہنچتا ہے۔ چنانچہ کسٹم ڈیوٹی بھی دو لاکھ روپے کے سامان پر لگتی ہے۔ اس طرح کراچی کے بے شمار تاجر اور لائسنس یافتہ تجارتی ادارے اصل سامان کے مطابق کسٹم ڈیوٹی ادا نہ کر کے حکومت کو لاکھوں روپے کا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

جعلی دوا ساز فیکٹریوں اور کاروباری اداروں کی طرح بے شمار کاروباری ادارے بیرونی ملکوں کو نقلی مال سپلائی کر کے، جہاں شب و روز لاکھوں روپے بنا رہے ہیں وہاں بیرون ممالک حکومت کی ساکھ اور وقار کو شدید دھچکا بھی پہنچا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کی سرپرستی اور تحفظ کے باوجود گذشتہ دس بارہ سالوں سے پاکستان کی برآمدات میں اضافہ نہیں ہوا۔ اور جس سے حکومت کو اب تک کروڑوں روپے کا نقصان ہو چکا ہے۔

پاکستان بالخصوص کراچی کے عوام اصلی اور نقلی تجارتی کمپنیوں اور کاروباری اداروں کے ہاتھوں لٹ رہے ہیں۔ زندہ درگور ہیں۔ راتوں رات دولت مند بننے کا خواب دیکھنے والے انسان کی قیمتی زندگی سے کھیلنے میں مصروف ہیں۔ موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا مریض کو اصلی دوا کی جگہ نقلی دوا ملتی ہے۔ زندگی کی آخری امید بھی بجھ جاتی ہے۔ ایک فرد کی موت پورے گھرانے کی موت بن جاتی ہے۔ مگر زیر زمین ادویات ساز فیکٹری اور ڈسٹلریز میں نقلی ٹیکہ اور ادویات تیار کرنے والوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ ان کے اس غیر قانونی کاروبار سے کتنی انسانی جانیں تلف ہو رہی ہیں۔ دوسری نوعیت کے کاروباری اداروں کو بھی اس کی پروا نہیں کہ ان کے جعلی دھندے سے کتنے غریب انسانوں کی محنت اور جذبے کا خون ہو رہا ہے۔ عوام اور حکومت کو دھوکا دینے والی جعلی کمپنیاں اور ادارے ملک کے چہرے پر کوڑھ کا ایک بدنما داغ ہیں۔

فرید شمسی

مزدور کا خوں

ڈالر کا ہو انبار کہ روبل کا خزینہ
مزدور کا دونوں میں جھلکتا ہے پسینہ

زردار کے ماتھے پہ شکن تک نہیں پڑتی
مزدور کی رگ رگ سے ٹپکتا ہے پسینہ

کچھ قاقم و سنجاب پہ سوتے ہیں، مگر ہم
ترسیں ہیں یہاں نانِ جویں کو بھی شبینہ

کھلتے ہیں جبھی اصل میں ملاح کے جوہر
طوفان کی زد میں کبھی آتے جو سفینہ

شمسی کوئی تدبیر کرو ورنہ جہاں میں
بہہ جائے گا مزدور کا خوں ہو کے پسینہ



نوٹس بنام [illegible] غلام محمد ولد عارف ساکن لپو۔

تم کو بذریعہ نوٹس ہذا [illegible] عدالت میں [illegible] ریاست کے اندرونی معاملات [illegible] دخل اندازی [illegible] الزام کی صفائی [illegible] عدالت میں حاضر ہو کر [illegible] ورنہ تمہارے خلاف قانونی کاروائی کی جائے گی۔

Major
(AYYASH KHAN)
Political Secretary to Mir of HUNZA

یہاں عدالت نام کی کوئی چیز نہیں

میر کی زبان قانون ہے

الفتح رپورٹ

"**ریاست ہنزہ** کا غلام محمّد ولد عارف ساکن لپو، میر آف ہنزہ کی جیل میں پا بندِ سلاسل ہے اُس پر ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا الزام ہے لیکن میر آف ہنزہ نے اُس پر مقدمہ چلائے بغیر غیر قانونی طور پر گذشتہ ایک ماہ سے جیل کی اندھیاری کوٹھری میں ڈال رکھا ہے، خوراک تک مہیا نہیں کی جاتی۔ طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی جا رہی ہیں اور غیر انسانی سلوک کیا جا رہا ہے۔ خدشہ ہے کہ اُسے قتل نہ کر دیا جائے۔ وزارتِ داخلہ و امورِ کشمیر ریذیڈنٹ گلگت و بلتستان اور پولٹیکل ایجنٹ گلگت کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی گئی لیکن شنوائی نہیں ہوئی"

یہ ایک اپیل ہے جو تحریکِ آزادیٔ ہنزہ و نگر کے کنوینر مسٹر مولا مدد نے صدرِ پاکستان سے کی ہے اور غلام محمد کی جان بچانے کے لئے مناسب اقدامات کی استدعا کی ہے کیونکہ ہنزہ و نگر پاکستان کا حصّہ ہے۔ یہاں کے عوام کی جان و مال کی ذمہ داری حکومتِ پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔

ہنزہ و نگر کے مظلوم عوام کی داستانِ حیات المناک اور دردناک ہے، فرنگی لٹیروں نے بھیڑ بکریوں کی طرح ۵، ۷ لاکھ روپے کے معاوضہ میں جموں و کشمیر کے عوام کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا تو عوام نے تحریکِ مزاحمت شروع کی۔ برطانوی نوآبادکاروں اور ڈوگرہ شاہی کے خلاف احتجاج اور جدوجہد شروع کی۔ تحریک کو کچلنے کے لئے ڈوگرہ شاہی نے سامراجی حربہ استعمال کیا۔ ہنزہ و نگر بطور جاگیر میر آف ہنزہ اور میر آف نگر کو دے دیئے۔ اِن جاگیرداروں کو عوام سے بیگار لینے، ظلم و تشدّد اور لُوٹ کھسوٹ کرنے کی کھلی اجازت تھی۔ میر کی زبان یہاں کا قانون، اور ہر حریت پسند، سامراج دُشمن اور محبِ وطن غدار قرار پایا۔ یہاں کے عوام کو جان بُوجھ کر تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے پسماندہ رکھا گیا تاکہ وہ اپنا حق طلب نہ کر سکیں۔ میر آف ہنزہ اور میر آف نگر ڈوگرہ شاہی کے ایجنٹ اور پروردہ تھے۔ ریاست جموں و کشمیر کو بطور اظہارِ وفاداری سالانہ باج (نذرانہ) دیا کرتے تھے۔ میمورنڈم آف انڈین اسٹیٹس ۱۹۳۷ء کے مطابق میر آف ہنزہ، ۱۶ تولے ۵ ماشے اور میر آف نگر، ۷ تولے ایک ماشہ سونا ڈوگرہ دربار کو دیا کرتے تھے، اور اس نذرانے کی بدولت عوام پر ظلم و تشدّد اور استحصال کرنے کی سند پاتے۔

ہنزہ و نگر کے عوام نے میروں کی مخالفت کے باوجود تحریکِ پاکستان کی حمایت کی، ڈوگرہ شاہی کی فوجوں سے دو بدو مقابلہ کیا۔ اور کامرانی حاصل کی، لیکن قیامِ پاکستان کے بعد بھی یہ میر برسرِ اقتدار ہیں۔ ہنزہ و نگر پر اُن کی حکومت ہے۔ یہاں کے عوام اِن ریاستوں کو ختم کر کے پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں لیکن یہ میر اس تحریک کے زبردست مخالف ہیں۔ جو شخص اپنا حق طلب کرتا ہے۔ اُس پر غداری کی چھاپ لگا کر کال کوٹھری میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ جس پر غداری کا الزام لگایا جاتا ہے اُس پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جاتا نہ صفائی کا موقع نہیں دیا جاتا ہے۔ حالانکہ قانون اور انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ عدالت میں مقدمہ چلایا جائے لیکن ہنزہ و نگر میں عدالت نام کی کوئی چیز نہیں۔ میروں کی زبان اور حکم ہی قانون اور انصاف ہے۔ اگر کوئی قیدی اپنی غیر قانونی حراست پر احتجاج کرے تو اُسے غائب کر دیا جاتا ہے۔ ایسے کئی لوگ لاپتہ ہو چکے ہیں خدشہ یہی ہے کہ اُنھیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ پولٹیکل ایجنٹ اور وزارتِ داخلہ و امورِ کشمیر کے بدعنوان افسروں نے میروں سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ میروں کے جبر و تشدد، لوٹ کھسوٹ اور استحصال میں یہ برابر کے شریک ہیں کیونکہ میروں کے خلاف کوئی شکایت نہیں سنی جاتی۔ شکایات کو دبا دیا جاتا ہے تاکہ پاکستان کے عوام کو صحیح صورتِ حال معلوم نہ ہو۔ غلام محمد ولد عارف ساکن لپو نے بھی اپنے حقوق کے لئے آواز اُٹھائی تھی۔ یہ بات میر آف ہنزہ کو بُری لگی۔ میر کے پولٹیکل سیکرٹری نے غلام محمّد کو میر کی عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ ۲۰ جولائی کو عدالت میں حاضر ہُوا۔ لیکن اُسے صفائی کا موقع دیئے بغیر پسِ زندان کر دیا گیا۔ جہاں اس پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔

انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ ہنزہ و نگر کے عوام کی خواہشات کا احترام کرتے ہُوئے میروں کی ریاستوں کو ختم کر کے یہاں کے عوام کو جمہوری اور بنیادی حقوق دیئے جائیں تاکہ وہ میروں سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

پیکنگ سے
حفاظ الرحمن
نے لکھا



پیکنگ سے شاؤ شان تک

پیکنگ کا موسم کراچی کے موسم سے بھی زیادہ محبوب ادا ہے۔ کراچی تو یونہی بدنام ہے۔ موسم اس تیزی سے رنگ بدلتا ہے کہ جیسے تمام منطقے اسی ایک شہر میں سما گئے ہوں۔ چھ سات ماہ تک درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔ خاصی برف باری ہوتی ہے۔ تین چار ماہ گرمیوں میں گزر جاتے ہیں۔ گو یہ گرمی لاہور کی طرح جان لیوا نہیں ہوتی۔ لیکن سات ماہ تک سردی گزارنے کے بعد ناقابل برداشت ضرور ہو جاتی ہے۔ بہرحال موسم بہار اتنا گلابی ہوتا ہے کہ ساری کسل مندی دور ہو جاتی ہے۔ سردی کا زور ٹوٹتا ہے اور بہار دبے پاؤں دھیرے دھیرے سامنے آتی ہے۔ اور دل کے دروازوں پر دستک دینے لگتی ہے۔ ننگے اور مرجھائے ہوئے درختوں میں جان پڑنے لگتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے ایک دم زندگی کا گیت فضا میں بکھیر دیا ہو۔ کتابوں میں پڑھتے آئے تھے لیکن اپنے مشینی شہر کراچی میں بہار کی رنگینیوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ چپکے چپکے درختوں میں کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ پتے ڈرتے ڈرتے سر اٹھاتے ہیں۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے تمام ننگے اور مرجھائے ہوئے درخت سبز رنگ میں نہا جاتے ہیں۔ ان ننھے ننھے نرم نرم سے پتوں میں جو تازگی اور شگفتگی ہوتی ہے، جو چمک ہوتی ہے وہ آنکھوں کے لئے مفید ہو نہ ہو لیکن ہمارے لئے جن کی آنکھیں سردی کے طویل موسم میں ٹنڈ منڈ درختوں کو دیکھتے دیکھتے پتھرا جاتی ہیں یہ رنگ عجب اجنبیت کے ساتھ دل کی تمام کلیوں کو کھول دیتا ہے۔ اس وقت بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اندھیرے کمرے سے نکل کر کھلے آسمان میں نکل آیا ہو۔

اس رومانوی سی توجیہہ کے علاوہ اس کا ایک "مخصوص مادی جواز" بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ جو غالباً زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ سردیوں میں جسم پر کوئی دو من وزنی کپڑے ہوتے ہیں ان سے چھٹکارا مل جاتا ہے اور پھر اس وقت ایک قمیص اور ایک پتلون کتنی نعمت معلوم ہوتی ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کمبل اتار کر کاغذ پہن لیا ہو۔ اور پورا جسم ہلکا ہو گیا ہو۔ اس مزدور کی مانند جو منزل پر پہنچ کر اپنا بوجھ نیچے زمین پر اتار پھینکتا ہے۔ اور سمندر جتنا گہرا سانس لیتا ہے جس میں تمام اذیتوں کا درد اور تمام لمحوں کی خوشیاں شامل ہوتی ہیں۔ ہم بھی اپنے بھاری بھاری کپڑے پھینک کر گہرا سانس لیتے ہیں۔ اس وقت دل یہی چاہتا ہے کہ ناچتے گاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئیں اور سب مل کر جشن منائیں۔ ویسے بھی "موسم بہار کا تہوار" (چھین چیے) چین کا سب سے بڑا روایاتی تہوار ہے چینی کیلنڈر کا نیا سال اسی موسم سے شروع ہوتا ہے۔ سرکاری طور پر تین دن کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ اتنی چھٹیاں کسی اور تہوار کی نہیں ہوتیں۔ اس تہوار کی توجیہہ بھی اتنی "رومانوی" نہیں ہے جتنی کہ اس کا نام۔ یہ کسانوں کا تہوار ہے جو اس خوشی کی علامت ہوتا ہے کہ وہ اب اپنا کھیتی باڑی کا کام شروع کریں گے۔

مشرقی ہوا مغربی ہوا پر غالب آرہی ہے



احفاظ الرحمٰن برآمدی اشیاء کی نمائش کوانگچو کے گراؤنڈ فلور کے سامنے

یہی وہ گلابی موسم ہوتا ہے جب "غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر" کی طرف سے یہاں کام کرنیوالے غیر ملکی دوستوں کے لئے چین کے مختلف شہروں کا دورہ ترتیب دیا جاتا ہے۔ پچھلے سال کی چھٹیاں میں نے پاکستان میں گزاری تھیں اور اس سال میں اس سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اب تک میں نے پیکنگ کے علاوہ شمالی چین کا ایک اور شہر تیئنتسن دیکھ رکھا تھا جو کہ صنعتی اعتبار سے چین کا دوسرا اور آبادی کے لحاظ سے تیسرا بڑا شہر ہے۔ ان میں میں نے سیاسی اور سماجی میدانوں میں ترقی اور خوشحالی کا جو حیرت انگیز منظر دیکھا تھا۔ اسے میں اپنی "قناعت پسندی" کی وجہ سے انسانی جذبوں کی معراج سمجھتا تھا۔ اور اب جب اس دورے کے دوران میں نے جنوب کی سرخ زمین پہ قدم رکھا تو مجھے احساس ہوا کہ ماؤزے تنگ کے اس قول "دنیا میں سب سے بڑی قوت ہتھیار اور مشینیں نہیں ہیں، بلکہ انسان ہے!" میں کتنی صداقت اور کتنی گہرائی ہے اور پھر یہ کہ اس اسپرٹ کا مظاہرہ چینیوں نے کس صداقت اور کس گہرائی کے ساتھ کیا ہے۔

ویسے تو آپ چین کے کسی کونے میں چلے جائیں، منگولیا سے لے کر تبت تک ہر جگہ فطرت پر انسانی تسخیر کے نشانات نظر آئیں گے۔ ہر جگہ خوشحالی کا سماں نظر آئے گا۔ لوگوں کے چہروں پہ سچی مسکراہٹوں کے پھول کھلتے نظر آئیں گے۔ فیکٹریوں اور کمیونوں میں مزدور اور کسان بین الاقوامیت کے جذبے سے سرشار ہو کر جفاکشی کے ساتھ کام میں مصروف نظر آئیں گے۔ لیکن بہرحال جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے مختلف علاقے مختلف اہمیت رکھتے ہیں۔ جنوب شمال سے کافی مختلف نظر آتا ہے۔ اس لئے میری معلومات میں کئی پہلوؤں سے اضافہ ہوا۔ یہاں کی بولی بھی شمالی چین سے مختلف ہے۔ پیکنگ میں "نی ہاؤ" (سلام) کہتے ہیں اور سنگھائی والے "ننگ ہاؤ" کہتے ہیں۔ پیکنگ میں "تھا" (وہ) کہا جاتا ہے۔ اور شنگھائی میں "ای"۔ ویسے جہاں لہجوں کے فرق کی وجہ سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں وہیں چینی زبان کی ایک خوبی یہ ہے کہ تحریری زبان ایک ہی ہے۔ اگر کوئی شخص لہجے کے فرق کی وجہ سے آپ کی بات نہ سمجھ سکے تو اسے لکھ کر بتا دیجئے، فوراً سمجھ جائے گا۔

ہمارا گروپ دس افراد پر مشتمل تھا۔ جس میں میرے علاوہ تین امریکی، ایک ویت نامی، ایک سوئیڈش جوڑا اور تین چینی کامریڈ شامل تھے۔ ہماری پہلی منزل کوانگچو تھی۔ کوانگچو کینٹن کا پرانا اور اصل نام ہے انگریزوں نے جب چین کو نوازا تو اسے کینٹن بنا دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے یہاں لائلپور اور جیکب آباد۔ لیکن اب وہ پرانے بورژوا چینی نہیں رہے جو اپنے آقاؤں کی عطا کردہ نشانیوں کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ اب یہاں مزدوروں اور کسانوں کا راج ہے۔ غلام بنانے والا طبقہ بھی نابود ہو گیا ہے اور غلامی کی تمام نشانیاں بھی ماضی کے کھنڈر میں دفن کی جا چکی ہیں۔ ہمارے یہاں یہ نشانیاں ابھی تک موجود ہیں کیوں کہ وہاں غلام بنانے والا طبقہ ابھی موجود ہے جو بڑی وفاداری کے ساتھ اپنے آقاؤں کی بخشی ہوئی نشانیوں کی حفاظت کر رہا ہے ویسے اب بھی جہاں کہیں کوانگچو کے مشہور تجارتی میلے کا نام آتا، وہاں کینٹن کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں غیر ملکی تاجر شرکت کرتے ہیں۔ جو اسے اسی نام سے جانتے ہیں۔

کوانگچو میں ہم تونگ فانگ ہوٹل (مشرقی ہوا) میں ٹھہرے۔ یہ نام "تونگ فانگ" یہاں بہت مقبول ہے۔ یہاں بیشتر اشیاء "تونگ فانگ" ہوتی ہیں۔ تونگ فانگ جہاز، تونگ فانگ کار، تونگ فانگ سگریٹ، تونگ فانگ کارخانہ۔ اسی طرح چینی مشرقی ہوا کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ جو "مغربی ہوا پر غالب آرہی ہے!" چونکہ یہ ماؤزے تنگ کا قول ہے، اور اس میں صداقت ہے۔ اس لئے چینی اسے پورے جذبے کے ساتھ مادی شکل میں بھی پیش کرتے ہیں۔ چین کا ایک بہت مشہور گیت ہے جو آجکل بچے بچے کی زبان پر ہے۔

تونگ فانگ چیوئے، چانگ ہوئے
تسنزئے تسرچے شیانگ چیونگ شوئے پھاشوئے
پشیرتزن من پھانیتی ارشتر منیتی پھاتزن من
تاتاؤسچو تسرٹاؤ کواچو
لی تشرکوئے تونی ٹیکھا کھانگ چونکپھا کھانگ چو
مےتےکوچی ای چی تزن مئے وانگ
چھوان تشرچے تزن من ای تنگ تنگ لی
(مشرقی ہوا چل رہی ہے۔ جنگی طبل بج رہا ہے۔ آج کی دنیا میں کون کس سے خائف ہے۔ عوام امریکی سامراج سے خائف نہیں ہیں بلکہ امریکی سامراج عوام سے خائف ہے۔ منصفانہ نصب العین کو حمایت حاصل ہوتی ہے۔ غیر منصفانہ نصب العین کو حمایت حاصل نہیں ہوتی تاریخی قوانین اٹل ہوتے ہیں، امریکی سامراج کی شکست یقینی ہے۔ عوام کی جیت یقینی ہے!)

تونگ فانگ ہوٹل چھ منزلہ لمبا چوڑا ہوٹل ہے۔ کوانگچو کی تجارتی نمائش میں شرکت کرنے والے تاجر یہیں ٹھہرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دریائے چو (PERL RIVER) کے کنارے ایک ۲۶ منزلہ ہوٹل بھی ان کے لئے مخصوص ہے۔ نمائش ختم ہونے میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ بہت سے تاجر اپنے



پرانی دُنیا کی نمائندگی کرنیوالے مجسّمے منّہ کے بَل گرے ہوئے تھے

دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں فوشان میں کھایا۔کیونکہ سہ پہر کو ہمیں ایک کرسٹل ریڈیو فیکٹری دیکھنی تھی۔ہم ایک بار پھر چونکے۔ یہ فیکٹری بھی ایک چھوٹی سی بدنما سی دو منزلہ عمارت میں تھی۔ چند کمرے تھے جہاں تمام کیمیاوی مراحل کی تکمیل ہوتی تھی۔کسی کالج یا یونیورسٹی کی لیبارٹری معلوم ہوتی تھی۔ یہاں کل ۲۲ مزدور کام کرتے ہیں۔ جن میں سے بیشتر شہروں سے آئے ہوئے طالب علم ہیں۔ پہلے بھی پہلے اسی فیکٹری کا مختصر سا تعارف کرایا گیا۔ دو تین مزدور تھے اور تیکھے تیکھے نقوش والی ایک بیس سالہ لڑکی، جو ابھی ابھی مڈل اسکول پاس کر کے یہاں آئی تھی۔ کوانگ تنگ صوبے کے شہر سانھتو کی یہ لڑکی باسکٹ بال کی بہت اچھی کھلاڑی ہے۔ اس نے اسکول میں کبھی سائنس نہیں پڑھی تھی۔ لیکن وہ کیمیاوی مراحل کے بارے میں بڑی سنجیدگی اور مہارت کے ساتھ تمام جزئیات پر روشنی ڈال رہی تھی۔ اور ہم میں سے ہر ایک مسحور ہو کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ یہ فیکٹری شہروں سے آئے ہوئے طالب علموں نے خود انحصاری (یہ لفظ پھر آگیا) کے اصول کے تحت قائم کی تھی۔ صرف چند آزمودہ کار مزدوروں نے اس کی تنصیب میں ان کی مدد کی تھی۔ یہاں کے بیشتر مزدوروں کو چینی مٹی کے برتنوں کے کارخانوں میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ اس لڑکی نے ہمیں بتایا کہ اصل چیز عمل ہوتا ہے۔ صدر ماؤ نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔ چنانچہ ہم نے تجربہ نہ ہونے کے باوجود عمل کے ذریعے سیکھنے کے اصول کے تحت چھوٹے سے پیمانے پر اپنا کام شروع کر دیا۔ اور ۱۹۶۹ء میں یوم اکتوبر پر کرسٹل کی پہلی کھیپ تیار کی۔ اب ہم اوسطاً روزانہ دو کلو کرسٹل تیار کرتے ہیں۔ ثقافتی انقلاب سے قبل سوویت یونین چین کو پچاس ہزار یوان (ایک لاکھ روپیہ) فی کلو کے حساب سے ہر سال صرف ۲ کلو کرسٹل دیا کرتا تھا۔ اب یہاں ہر ماہ ساٹھ کلو کرسٹل تیار ہوتا ہے اور ایک کلو پر صرف آٹھ ہزار یوان لاگت آتی ہے۔ یہاں ایک ادھیڑ عمر کی عورت بھی کام کرتی ہے۔ جو پہلے ایک آیا کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ وہ بالکل عام سی ان پڑھ عورت ہے۔ لیکن اب اسے اپنے کام پر پورا عبور حاصل ہے۔ کیونکہ اس نے سب کچھ عمل کے ذریعے سیکھا ہے۔ ہمارے یہاں کتنے انجینئر ہیں جو دفتر سے نکل کر مشین کے سامنے جاتے ہیں۔ تو ان کے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔ یہ تک نہیں معلوم ہوتا مشین کا منہ کس طرف ہے۔ لیکن اس کا ماتحت ایک معمولی سا مزدور اسے کتنی آسانی سے کھول لیتا ہے۔ بہرحال یہاں کے مزدور عمل کو زیادہ اہمیت ضرور دیتے ہیں۔ لیکن تھیوری کو بھی نظرانداز نہیں کرتے۔ یہاں کے کارکنوں کو تربیت کے لئے شنگھائی بھیجا جاتا ہے جہاں وہ اعلیٰ سطح پر تعلیم حاصل کرتے ہیں اور واپس آکر اپنے ساتھیوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ یہاں کا ایک مزدور کوانگچو کی سن یات یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس وقت چین میں صرف مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کی صفوں سے آئے ہوئے نوجوان تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ یہاں کا نیا تعلیمی نظام ہے۔ جو ثقافتی انقلاب کے دوران متعارف کرایا گیا ہے۔ ان طالب علموں کو چینی میں "کنگ نُنگ پنگ شُہتے" (مزدور۔ کسان۔ سپاہی طالب علم) کہا جاتا ہے۔ چینی میں یہ ایک مختصر سا لفظ ہے۔ لیکن اردو میں ترجمہ ہو کر بہت لمبا اور اجنبی سا ہو گیا ہے۔ ویسے بھی ہمارے یہاں یہ لفظ اجنبی ہی ہو گا۔ بھلا ایک عام سا مزدور یا کسان یونیورسٹی میں کیسے قدم رکھ سکتا ہے!

اگلے دن ہم کوانگچو سے پھر فوشان آئے۔ اسی دن ہم نے ایک کارخانہ دیکھا جس میں چینی مٹی کے مجسمے اور برتن وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ ایک بہت خوبصورت چینی طرز کی عمارت تھی۔ ہر طرف پھولوں کے گملے بکھرے ہوئے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں کنول کے پھول تیر رہے تھے۔ سامنے ماؤزے تنگ کا ایک مجسمہ کھڑا ہوا تھا۔ صنوبر کے خوبصورت درخت ہوا میں جھوم رہے تھے۔ بڑا "دانشورانہ" سا ماحول تھا۔ لیکن آرٹسٹوں کے جن نمائندوں نے ہمارا خیر مقدم کیا، ان کے چہروں پر دانشورانہ رنگ کی ہلکی سی جھلک نہیں تھی۔ یہ نئے چین کے نئے دانشور تھے جو بڑی انکساری سے سر جھکا کر کہتے تھے "قوت کا سرچشمہ مزدور اور کسان ہیں، ہمیں ابھی ان سے بہت کچھ سیکھنا ہے!"

اس کارخانے میں کل ۴۰۰ افراد کام کرتے ہیں۔ جن میں سے ستر فی صد عورتیں ہیں۔ یہ یہاں کی آٹھ سو سالہ پرانی مشہور صنعت ہے۔ پہلے سیسے پر ماڈل بنائے جاتے ہیں۔ پھر ان کے اندر مٹی بھر دی جاتی ہے۔ بعد میں باہر نکال لیا جاتا ہے۔ اس وقت مٹی تھوڑی نرم ہوتی ہے۔ جہاں کہیں نقوش ناموزوں ہوتے ہیں انہیں انگلیوں اور موٹے قلم سے درست کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آرٹسٹ ان پر رنگ چڑھاتے ہیں۔ سوکھنے پر انہیں بھٹی میں ڈال دیا جاتا ہے یہاں بیشتر کام ہاتھ سے ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں بتایا گیا کہ مستقبل میں مشینوں پر یہ کام کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم نے بہت سے شعبوں میں جا کر کام دیکھا بڑے خوبصورت مجسمے تھے۔ دل چاہتا تھا سب اپنے ساتھ لے جائیں۔ مختلف قسم کے موضوعات تھے

دُور دراز دیہات میں مزدُور اپنی ضرورت کی مشینیں خود تیار کر رہے ہیں

لیکن ان میں مزدوروں اور کسانوں اور فوجیوں کے مثالی ہیروؤں اور اوپیرا بیلے کے فن کاروں کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ فلسطینی اور ویت نامی مجاہدوں کے مجسمے دشمن کی طرف بندوقیں تانے ہوتے تھے ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ایک تبتی لڑکی اپنی چھوٹی بہن کو ماؤزے تنگ کے اقوال پڑھا رہی تھی۔ ایک بوڑھا کسان کھیت میں کام کرنے کے بعد پائپ پی رہا تھا۔ اس کے جھریوں والے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہو۔ "یہ لہلہاتے کھیت، فلک بوس پہاڑ، وسیع میدان سب میری مٹھی میں ہیں۔ میں ان کا مالک ہوں"۔ شاید یہ وہی "بیوقوف بوڑھا" تھا جس نے پہاڑ کاٹ گرائے تھے (جب سے ماؤزے تنگ نے اپنے مضمون میں اس پرانی چینی حکایت کا حوالہ دیا ہے۔ اس وقت سے چین میں یہ لفظ بلند حوصلگی کی علامت بن گیا ہے اور بوڑھوں اور کسانوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے) ایسے "بیوقوف بوڑھے" مجھے چین میں ہر جگہ نظر آئے کھیتوں میں، ملوں میں، پہاڑوں میں، میدانوں میں ہر جگہ وہ فطرت پر انسانی عظمت کے نقوش ثبت کر رہے ہیں اور فطرت بھی بڑی فراخدلی سے باہیں کھولے ان کی منتظر رہتی ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو "آؤ میرے بچو، تم میرے سب سے بلند ہمت بچے ہو، میرا سب کچھ تمہارا ہے!"

تمام آرٹسٹ بڑی محویت کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ برسوں سے یہی کام کرتے ہیں۔ لیکن اب کی فنکار انگلیوں کے نیچے نئے ماڈل آگئے ہیں۔ نئی زندگی کے نئے نمائندے! ان کے ہاتھ بڑی مہارت سے نرم مٹی پر ادھر سے اُدھر گھوم رہے تھے ناموزوں نقوش کو حسن بخش رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر ہماری طرف مُسکرا دیتے۔ ہم مجسموں کو خوشیوں کے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ ان میں ایک نئی روح پھونک رہے ہیں۔ یہ مجسمے دنیا کے تمام دکھوں کے لئے ایک بہت گہری قبر کھود دیتے ہیں مصروف ہیں۔ وہاں شوکیسوں میں پُرانی دنیا کی نمائندگی کرنے والے مجسمے بھی رکھے ہوئے تھے۔ لیکن سب کے سب مُنہ کے بل گرے ہوتے تھے۔ بڑے بڑے پروہت، جنگ باز سردار، لفظوں کے مستری ادیب اور فلسفی انہیں وہاں جان بُوجھ کر اسی طرح رکھا گیا تھا تاکہ نئے مجسمے دیکھ سکیں کہ ان پُرانے مجسموں کے چہرے کتنے مکروہ ہیں۔ صدیوں کی غلاظت میں لتھڑے ہوئے یہ وہ مجسمے تھے جو تمام خوشیاں چند جھولیوں میں بھر دیتے تھے اب وہ مُنہ کے بل گرے ہوئے ہانپ رہے تھے۔ انسان جاگ اُٹھا ہے۔ اس نے تمام زنجیریں توڑ ڈالی ہیں اور وہ زندگی کو نئی زبان دے رہا ہے۔ اور اس نے جو مجسمے بنائے ہیں وہ ان کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے "اب ہم تمہیں کبھی نہیں اُٹھنے دینگے۔ تم نے صدیوں ہمیں ہمارے رنگوں سے محروم رکھا۔ اب یہ نئی دُنیا ہماری ہے۔ سارے رنگ ہمارے ہیں، سارا حسن ہمارا ہے۔ زندگی کا درخت ہمارا ہے اور اس کی چھاؤں ہماری ہے۔ ہم نئی زندگی پر پرانی زندگی کا سایہ نہیں پڑنے دیں گے۔ کبھی نہیں" اور ایک آرٹسٹ ہم سے کہہ رہا تھا۔ "ہمارے کام میں بہت سی خامیاں ہیں، ہمیں مزدوروں اور کسانوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے"۔

کچھ دیر بعد ہم ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے آرٹسٹوں اور مزدوروں کے نمائندوں سے بات کر رہے تھے۔ لمبی سی میز پر کارخانے کے بنائے ہوئے خوبصورت راکھ دان رکھے ہوئے تھے۔ ایک آرٹسٹ ہمیں اس کارخانے کی کہانی سنا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی بال گھنگھریالے تھے، جو چین میں عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتے۔ بڑی سادہ سی زبان میں بڑی گہری باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ "یہ کارخانہ ۱۹۵۸ء میں مقامی حکومت کی نگرانی میں آیا تھا۔ اس کے بعد سے ہم نے نئے موضوعات پر زور دینا شروع کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود ثقافتی انقلاب سے قبل تک لیو۔ شاؤچی کی ترمیم پسندانہ راہ عمل کے اثرات کی وجہ سے پرانے عہد کے داستانی ہیروؤں کو مثالی حیثیت دی جاتی تھی، اس لئے نئی زندگی کو جو بڑی تیزی کے ساتھ منزلیں طے کر رہی تھی، مناسب نمائندگی نہیں مل سکی۔ ہمارا فن اس وقت حقیقت سے دور تھا، کیونکہ ہم مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ ہمارے رنگوں میں کوئی جان نہیں تھی، ثقافتی انقلاب کے دوران ہم نے نئے خطوط پر کام کرنا شروع کیا۔ ہم نے اس بات پر غور کرنا شروع کیا کہ آخر ہمارا فن کس کے لئے ہے، اور یہ کہ ہمارے فن سے ہمارے نصب العین کی تکمیل ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ ہم نے جاگیردارانہ عہد کے تمام ماڈلوں کو منہ کے بل گرا دیا اور اپنا فن نئے عہد کے پرولتاری ہیروؤں کے لئے وقف کر دیا۔ اب ہمارے نمائندے ملوں اور کھیتوں میں جا کر مزدوروں اور کسانوں سے ملتے ہیں، ان کی رائے سنتے ہیں اور واپس آکر ان کی پسند کے مطابق نئے ماڈل تخلیق کرتے ہیں۔ پہلے ہم صرف تخیل پر زور دیتے تھے، لیکن ہمیں یہ احساس نہیں تھا کہ اگر تخیل زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوگا تو فن میں جان نہیں ہوگی۔ اب ہم اپنے فن کو زندگی کے قریب رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کے لئے ہم بے جان مجسموں کے خالق چلتی پھرتی زندگی کے خالقوں سے ملتے ہیں ان کے ساتھ رہتے ان کی باتیں سنتے ہیں۔ اور ان کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وقت بھی ہمارے بہت سے ساتھی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اب ہم جب اپنے پرانے اور نئے فن کا موازنہ کرتے ہیں۔ تو اس میں بڑا فرق محسوس کرتے ہیں۔ اب ہمارے رنگوں میں تنوع پیدا ہوگیا ہے۔ اب ہمارے مجسمے نئی زندگی کے گیت گاتے ہیں۔ اب ہمارے اندر کا فن کار مطمئن ہے کہ ہمارا فن ایک محدود ماحول سے نکل کر دُنیا کی وسعتوں کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہے"۔

کارخانے میں ایک چھوٹا سا اسٹور بھی ہے۔ جہاں مختلف قسم کے مجسمے فروخت کئے جاتے ہیں۔ ہم میں سے تقریباً ہر ایک نے کوئی نہ کوئی چیز ضرور خریدی ویسے شاید میری طرح ہر شخص اس شش و پنج میں تھا کہ کس چیز کا انتخاب کرے۔ میں نے ایک گل دان اور لوسیوں کا ایک مجسمہ خریدا۔ انہوں نے بڑی احتیاط سے پیکنگ کی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہمیں پیکنگ واپس پہنچنے سے پہلے ایک بڑا طویل سفر کرنا تھا!

پرانے مجسموں کے دیس میں رہنے والا اپنے سفر کی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔

الوداع! نئے مجسموں کے خالقو! الوداع!!





"البلال" کی نمائش کے بعد محبوب، سیٹھ محبوب کہلانے لگا

گھر والوں کی تمام شرائط منظور کر کے میں پھر بمبئی کی طرف چل پڑا

ممتاز فلمساز و ہدایت کار ضیاء سرحدی نے الفتح کے لئے لکھا

اس دن کرانی کی شوٹنگ بھی تھی اور اس وجہ سے اختری کے کمرہ سے نکلنے کے بعد میں سیدھا اس کے فلور پر پہنچا۔ فلور پر SHOT کی تیاری تھی۔ فلم کی ہیروئن نورجہاں ریہرسل میں مصروف تھی اور بار بار اپنے ہیرو کے ساتھ ایک محبت کا مکالمہ بولنے کی مشق کر رہی تھی۔ ساگر حسین نے محبت کا لفظ کچھ اس طرح کی تکرار سے چپکا رکھا تھا کہ اس کا بار بار کا استعمال مجھے غایت درجہ مصنوعی معلوم ہوتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد بڑی جرأت سے کام لے کر میں نے کرانی باوا کے کان میں اپنی رائے کا اظہار کیا اور اُن سے کہا کہ یہ محبت کے لفظ کی تکرار اس طرح سے بُری معلوم ہو رہی ہے اور خاص طور پر اس لئے بھی جبکہ نورجہاں کا اندازِ نگاہ بجائے خود محبت کے جذبات کا ایک واضح اظہار پیش کر رہا ہے۔ جب نگاہیں سبھی کچھ کہہ رہی ہیں تو پھر بلا وجہ الفاظ کا بار بار کا تکرار SUPER FICIAL ہونے کے علاوہ منظر میں ایک ANTI CLIMAX کی سی صورت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

کرانی صاحب کو میرا یہ مشورہ بے حد ناگوار گذرا اور وہ گرج کر بولے کہ مسٹر ضیاء تم ابھی ناتجربہ کار ہو، اور ڈرامے کی خوبیوں سے بالکل بے بہرہ۔ جب پوری فلم میں یہ شارٹ جڑ کر آئے گا تو تم کو معلوم ہوگا کہ محبت کے لفظ کی تکرار کتنی خوبصورت اور DRAMA-TIC ہے۔ انہوں نے فوری طور پر مجھ کو یہ بھی جتا دیا کہ ایسی تکرار کو وہ اپنی پیش رو فلموں میں بھی آزما چکے ہیں اور کامیاب رہے ہیں۔ کرانی کی نگاہوں اور لہجے میں اس وقت کچھ ایسی تلخی تھی کہ میں سہم گیا بلکہ پچھتانے لگا کہ میں نے اس طرح سے مشورہ دینے کی حماقت کی ہی کیوں۔ کرانی کے علاوہ ساگر حسین کو بھی میرا اعتراض قابلِ اعتراض معلوم ہوا۔ اور اس دن کی شوٹنگ کے بعد انہوں نے خاص طور پر مجھ کو ڈرامے پر ایک طویل لیکچر سنا دیا۔ باوجودیکہ میں خود ہنوز معمولی طالب علم کی حیثیت رکھتا تھا اور مجھ کو اس ضمن میں اپنی کم علمی کا پورا پورا احساس تھا۔ مگر ساگر حسین کی تقریر مجھ کو حد درجہ سطحی اور جاہلانہ محسوس ہوئی۔ میں بہت بور ہوتا رہا۔ تاہم میں نے خاموشی سے کام لے کر ان کی تردید نہیں کی۔



فلم ساز و ہدایت کار محبوب

شام کو جب میں گھر لوٹا تو گل حمید اور نذیر گھر میں موجود تھے۔ یہ ان دنوں ٹالی گنج میں سٹوڈیو کے قریب گل حمید اور نذیر کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ یہ دونوں نوجوان میرے ان ایام کے گہرے رفیق اور ہمدرد تھے شوٹنگ کے بعد ہم تینوں اکثر اپنے اپنے دل کی بات ایک دوسرے کو بتایا کرتے تھے۔ اور خاص طور پر میں تو ان دونوں سے قدم قدم پر مشورہ ضرور لیا کرتا تھا۔ علاوہ فلمی معاملات کے گل حمید اپنے معاشقہ کی باتیں بھی کیا کرتا تھا۔ اور اپنی ان ایام کی محبوبہ پیشنس کوپر کی وفا شعاری اور اس کے اینگلو انڈین حسن کی ان تھک تعریف کیا کرتا تھا۔ اس بے تکلفی کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے قریب آ چکے تھے اور یہی وجہ تھی کہ میں نے گھر پہنچتے ہی میک اپ روم میں گزرا ہوا واقعہ گل حمید کو بتا دیا۔ گل حمید نے اپنی پختونی اردو میں مجھ کو اختری کے مختلف معاشقوں کی بہت سی داستانیں سنا ڈالیں۔ اور مجھے بتایا کہ وہ حد درجہ ہرجائی واقع ہوئی ہے اور کسی ایک سے ٹک کر محبت نہیں کرتی۔ اس کی محبت چند روزہ ہوتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ ان چند روز میں برسوں کی محبت ایک ساتھ کر لیا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات جو گل حمید نے مجھ کو خاص طور پر بتائی وہ ایسٹ انڈیا فلمز کے مالک کھیمکا کے متعلق تھی۔ اس نے بتایا کہ کھیمکا اختری کے ان لاتعداد رئیس عاشقوں میں سے تھا جو اپنی دولت کی فراوانی کی وجہ سے خود کو اختری کا مرد بننے کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ وہ اختری کو اپنی داشتہ کے طور پر رکھ لے۔ اختری کے ساتھ اس کے مراسم کی شکل خوابگاہ ہی تھی یا نہیں۔



فلم "فاصلہ" کی افتتاحی شوٹنگ میں دلیپ کمار اور ضیاء سرحدی کی ایک یادگار تصویر

اس کا علم تو حتمی طور پر کسی کو نہیں تھا مگر اختری کے حق میں کھیمکا کی JEALOUSY اور بخل خاصے نمایاں ہو کے رہ گئے تھے۔ چنانچہ چند روز کے بعد جب کھیمکا کو معلوم ہوا کہ میں دو چار مرتبہ اختری کے گھر آیا گیا ہوں تو حسب عادت اس نے میرے اس فعل کا بھی بُرا منایا۔ کرانی سے زوردار لفظوں میں میری بداخلاقی اور آوارگی کی شکایت کی۔ اور کرانی کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مجھ کو اپنی ملازمت سے برطرف کر دے پھر تو چند ہی روز میں کرانی نے میرے ہاتھ آخری تنخواہ تھما دی اور حکم صادر کر دیا کہ میں آئندہ سے سٹوڈیو نہ آؤں۔

ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد کچھ دن تو میں گھر ہی پر پڑا رہا پھر میں ایک روز دیوکی کے گھر پہنچا اور اس کو اپنی سرگذشت سنائی۔ دیوکی نے حسب عادت دبی زبان میں کہا:

KHEMKA IS A BASTARD, BUT DONT WORRY AND DO SEE ME AFTER A WEEK. I WILL SEE IF I CAN DO SOMETHING FOR YOU.

لیکن دیوکی کے ساتھ باقاعدہ کام کرنے کا میرا خواب خواب ہی کی حد تک رہ گیا۔ ملیریا کے خوفناک حملے نے مجھ کو گھر ہی میں بچھا کے رکھ دیا اور جب تمام علاج معالجوں کے باوجود بھی بخار نے پوری طرح سے ٹوٹنے کا نام نہ لیا تو میری صحت خطرناک موڑ پر آگئی گل حمید اور نذیر اور دوسرے چند دوست پریشان ہونے لگے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے فوری طور پر پشاور روانہ کر دیں۔ چنانچہ میری سیٹ بک کرا دی گئی اور مجھ کو ان ناقابل فراموش دوستوں نے ٹرین پر سوار کر دیا۔

کلکتہ سے پشاور تک کا تین روز کا سفر میری زندگی کا سب سے المناک سفر ثابت ہوا۔ صحت کی بدحالی تو جو تھی سو تھی۔ اس صدمے سے بڑھ چڑھ کر جو درد دل سے پیوست ہوتا چلا جا رہا تھا وہ کلکتے کی جدائی کا درد تھا۔ گل حمید اور نذیر سے علیحدگی کا درد تھا۔ دیوکی سے کچھ اور سیکھنے کی محرومی کا درد تھا۔ اور ان سب کے سوا وہ ایک ناقابل برداشت درد جو اختری کے نغمات کا دامن چھوٹنے کے خیال سے پے بہ پے دل کو مروڑے اور نچوڑے جا رہا تھا۔ ادھر رات کا غم انگیز سناٹا تھا اور گاڑی کی چھک چھک کچھ یوں تھی جیسے درد میں ڈوبے ہوئے کسی اجنبی نغمے کی لے ہو۔ سیٹ پر پڑے پڑے اور چادر میں منہ چھپائے ہوئے جانے میں کتنی بار رویا یہ تو مجھے یاد نہیں لیکن میرا خیال ہے میں بار بار رویا۔ بے حد رویا اور دبی آواز میں بھی دل کھول کھول کے رویا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میرا یہ اشک باری کا سلسلہ سفر کے ختم ہونے کے بعد ایک نئے صدمے اور غم کی وجہ سے کچھ اور بڑھ گیا۔ پشاور پہنچتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ کچھ دن پہلے میری ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔

خرابیٔ صحت کی وجہ سے مجھ کو وہاں پر دو ڈھائی مہینے تک رہنا پڑا۔ اس عرصہ میں گھر والوں نے ایک بار پھر مجھ کو فلم کی ڈگر سے ہٹانے کی کوشش کی۔ مگر اب کی ان لوگوں کے اصرار و نصیحت میں پہلی سی شدت نہیں تھی اور جہاں تک میرے اندازے کا تعلق ہے اس کا واحد سبب یہی تھا کہ یہ لوگ اس ضمن میں میری انتہا پسندی کو اب پوری طرح سے سمجھ چکے تھے۔ اور ان کو یقین ہو چکا تھا کہ میں کسی قیمت پر بھی اپنی پسند کردہ ڈگر کو ترک نہیں کروں گا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ان لوگوں نے خود ہی اپنا اسلوب فکر بدلنا شروع کر دیا۔ اور پھر اسی زمانے میں میرے والد صاحب نے بھی (جو اپنے کاروبار کے سلسلے میں عرصہ دراز سے چین میں مقیم تھے۔) ایک خط میں گھر والوں کو بالآخر یہی مشورہ دیا کہ اگر میرا ذوق فلم اتنا ہی دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا ہے تو مجھ پر جبر نہ کیا جائے۔ اور ایک مقررہ حد تک مجھ کو اپنے رجحانات کے مطابق فلم میں اپنی صلاحیت اور قسمت کو آزمانے کی پوری آزادی دے دی جائے۔ چھ مہینے تک اگر میں کامیاب ہو سکوں تو درست ورنہ اس کے بعد میں ان کے پاس شنگھائی چلا جاؤں۔ اور ان سے بزنس کی ٹریننگ حاصل کر کے وہیں پر رہائش اختیار کر لوں۔ گھر والوں کی دوسری شرط یہ تھی کہ میں بمبئی پہنچ کر اپنی ہمشیرہ کے ساتھ رہوں۔ دو سال پیشتر ہماری ہمشیرہ کی شادی بڑے چچا کے بیٹے کے ساتھ ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد وہ بمبئی شفٹ کر گئی تھیں۔ گھر والوں کی طرف سے یہ شرط اس خیال کے پیش نظر عائد کی گئی تھی کہ کسی نہ کسی بزرگ کی نگرانی میرے لئے ضروری تھی۔ اور پھر سب کو میری زبانی یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ بمبئی کے حالیہ قیام میں میں اپنی ہمشیرہ سے بھی چھپتا پھرا تھا۔ اور ان ایام میں مالی محرومیوں کی وجہ سے مجھے اکثر مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میں نے بہرحال بڑی دیانتداری کے ساتھ گھر والوں کی تمام شرائط منظور کر لیں۔

ہفت روزہ الفتح کراچی

اروناؔ نے ایسے کلوز اپ دیئے کہ اپنے کو "چکر" میں ڈال دیا

اور اپنی فلمی تگ و دو کی از سرِ نو تیاری شروع کر دی۔ روانگی سے پیشتر کچھ روز تک میں نے اپنی چند روزہ فلمی زندگی کے تجربات کی روشنی میں اپنی پہلی طبعزاد کہانی جو مصوّر کی زندگی پر مبنی تھی بڑے انہماک کے ساتھ کام کیا اور اپنی کم عمر سُوجھ بُوجھ کے مطابق فلم کے ایسے مروجہ لوازمات کو اُس میں خاصی حد تک شامل کر دیا جو میری دانست میں کہانی کو قابلِ قبول بنانے میں لازمی تھے۔

یہ سب ہو جانے کے کچھ روز بعد میں پھر بمبئی کی طرف چل پڑا لیکن اب کی میں ضیا سرحدی ہونے کے باوجود میں fugitive نہیں تھا۔ اور نہ میرے سامنے اب کی مختلف خدشات کا کوئی دیو یا بھیڑیا تھا۔ اب کی نہ مجھ کو قانون کا ڈر تھا۔ نہ بے خانمائی کا خوف اب کی میرے سامنے صرف فلمی مستقبل کے سابق تصوّرات تھے۔ اور بس۔ بمبئی پہنچتے ہی میں ساگر کے سٹوڈیو پہنچا اور محبوب سے ملا جو اب باضابطہ طور پر فلم ڈائریکٹر بن چکا تھا اور اس کا پہلا فلم "الہلال" ریلیز بھی ہو چکا تھا۔ اس فلم کو مناسب کامیابی حاصل ہوئی تھی اور اس کی وجہ سے اب بطور ڈائریکٹر محبوب کی مارکٹ میں خاصی مانگ تھی۔ ساگر کے مالکان اور انتظامیہ کے لوگ جو اس سے پیشتر، عام روش کے مطابق محبوب کو ایک معمولی ایکٹر سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دیا کرتے تھے، اب وہ تمام لوگ اس کے کام اور نام کو بیش قیمت سمجھنے لگ گئے تھے۔ الہلال کی نمائش کے چند ہی روز بعد ان سب لوگوں کے لئے محبوب کی پسند، اس کی رائے اور فیصلے نمایاں حد تک قابلِ احترام ہو چکے تھے۔ اب محبوب صرف محبوب اور "میاں بھائی" نہیں تھا۔ بلکہ وہ محبوب صاحب اور محبوب سیٹھ کہلانے لگ گیا تھا۔ لیکن ایسی کامیابی اور ترقی کے باوجود، مجھ کو اپنے طور پر محبوب کی گرمجوشی اور خلوص میں کوئی کمی اور تبدیلی نظر نہیں آئی اور میں جب اس سے ملنے کے لئے پہنچا تو اس نے میرا خیر مقدم اسی طرح سے کیا جس طرح سے پہلی ملاقات میں کیا تھا۔ اس کے چند روز بعد تک میں تقریباً روزانہ ساگر سٹوڈیو آتا جاتا رہا اور پھر اسی عرصہ میں ابتدائی اور رسمی گفت و شنید کے ختم ہوتے ہی ساگر کمپنی کے ساتھ محبوب نے اپنی دوسری فلم کے سکرپٹ اور مکالمہ کے لئے میرا معاہدہ کروا دیا۔ سات سو پچاس روپیہ میرا محنتانہ مقرر ہوا۔ کچھ رقم مجھ کو ایڈوانس کے طور پر ملی۔ جس کو جیب میں ڈالتے ہی میں نے زندگی میں اوّل مرتبہ خود کو ایک پیشہ ور فلمی افسانہ نگار سمجھنا شروع کر دیا۔ محبوب کی دوسری فلم کی کہانی جس پر ہفتہ بھر کے اندر اندر ہی میں نے باضابطہ طور پر کام شروع کر دیا تھا۔ ایک سوشیل مضمون کی کہانی تھی۔ اس کی روحِ رواں ایک باغی نوجوان لڑکی کا کردار تھا۔ جس کے ساتھ اس کے خاندان نے بالخصوص اور مجموعی طور پر معاشرے نے بہت ہی ناگفتہ بہ ناانصافیاں کر رکھی تھیں۔ اب یہ لڑکی ان دونوں دشمنوں سے انتقام لینے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ اور بحیثیت مجموعی محبوب کی یہ دوسری فلم اسی لڑکی کی داستانِ بغاوت تھی۔

کچھ عرصے میں اس فلم کی کاغذی تیاریاں مکمل ہو گئیں اور محبوب نے دوسری ضروریات کو زیرِ عمل لانے کے اقدامات شروع کر دیئے۔ شروع شروع میں کاسٹنگ کے بارے میں محبوب کا یہی خیال تھا کہ وہ فیمیل لیڈ کے لئے اپنی پہلی فلم الہلال کی ہیروئن اختری نام کی خاتون کو منتخب کرے گا۔ لیکن اس بارے میں غیر متوقع طور پر ساگر کے موجودہ تقسیم کار لالہ الوکھی پرشاد کا ایک مشورہ محبوب تک پہنچا۔ اس مرتبہ لالہ جی دلّی سے اپنے ساتھ

محبوب نے اپنی

کمپنی کے مالکان

کو الٹی میٹم

دے دیا

دو اور نئے چہرے لے آئے تھے۔ پچھلی مرتبہ لالہ جی کے ساتھ کاشمیرہ آئی تھی۔ مگر وہ کسی نہ کسی وجہ سے ناکام ہو کر لوٹ گئی تھی۔ اب کی لالہ الوکھی پرشاد کو نئی لڑکی اروناؔ دیوی اور نئے لڑکے سریندر ناتھ کی صلاحیتوں پر ناقابلِ تسخیر بھروسہ تھا۔ اور وہ حتمی طور پر مصر تھے کہ محبوب اپنی نئی فلم میں ان دونوں کو ہیرو اور ہیروئن کے طور پر کاسٹ کر لے۔

مگر اپنی پہلی ہیروئن اختری کے ساتھ فنکارانہ مراسم کے علاوہ اس وقت تک محبوب کے جنسی رشتے بھی دُور دراز تک پہنچے ہوئے تھے۔ اور اختری سے ایکا ایکی اس طرح کی علیحدگی محبوب کے لئے قطعاً ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ ان تمام پیچ و خم کی وجہ سے طویل مدّت تک لالہ الوکھی پرشاد اور محبوب میں رسہ کشی کا سلسلہ جاری رہا۔ محبوب کی ٹیم میں میرے علاوہ اس وقت فوٹوگرافر فریدون ایرانی، لیبارٹری انچارج ماسٹر گنگا دھر اور صدا بند مسٹر اسماعیل دھرکا شامل تھے اور ہیروئن کے چناؤ کے معاملے میں محبوب کو اپنی ٹیم کا مکمل سپورٹ حاصل تھا۔ اس کشمکش کے زمانہ میں مجھ کو محبوب کے ذہن پر سے ایک نیا پردہ ہٹتا ہوا نظر آیا اور میں نے پہلی بار یہ سمجھنا شروع کیا کہ محبوب، کاروباری ریشہ دوانیوں کا جواب اپنے طور پر نتیجہ خیز حکمتِ عملی اور ریشہ دوانی سے بھی دے سکتا ہے۔ اور اس میں فلم سازی کی صلاحیت کے علاوہ کاروباری صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ چنانچہ ایک روز محبوب نے مالکان کمپنی کو الٹی میٹم دے دیا اور بتایا کہ اگر کسی وجہ سے بھی اس کو اروناؔ دیوی کو کاسٹ کرنے پر مجبور کیا گیا تو وہ ساگر کو خیرباد کہہ دے گا۔

محبوب کے اس الٹی میٹم نے چند روز کے لئے ساگر کے حلقوں میں اچھی خاصی افراتفری پیدا کر دی تھی۔ مالکان فلم کمپنی اور لالہ الوکھی پرشاد میں روز و شب اور پس پردہ مشورہ ہونے لگ گئے تھے۔ مگر آخر کار تصویر کا رُخ محبوب کی پسند کے مطابق اُبھر کے نکلا اور یہ فیصلہ ہوا کہ اختری ہی محبوب کی نئی فلم میں کام کرے گی۔ سریندر کو بہرصورت محبوب نے اس سے پیشتر ہی قبول کر لیا تھا۔ کہ وہ سہگل کے انداز سے گایا کرتا تھا اور سہگل کی اچھی خاصی نقل کر لیا کرتا تھا۔

اختری کے کاسٹ ہو جانے کے بعد محبوب کی دوسری فلم جس کا نام "ڈیکن کوین" رکھا گیا تھا۔ اب تیزی کے ساتھ ابتدائی شوٹنگ کے مراحل کی طرف بڑھنے لگی تھی اور یہ توقع تھی کہ چند ہی روز میں

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

مالی امداد کے اعلان کی تان دست درازی پر ٹوٹی

ایک "خدا ترس" انسان کی نوجوان طالب سے "غم خواری" کی کہانی

نون - الف

"ایک مقامی اخبار میں مراسلات کے کالم میں شہر کے ایک گمنام متمول شخص کی جانب سے ایک مراسلہ شائع ہوا، جس میں اس خدا ترس بندے نے اپنے متعلق انکشاف کیا کہ "اس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے - اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مال میں ان غریب اور نادار بچوں کو شریک کرنا چاہتا ہے - جنہیں لکھنے پڑھنے کا شوق ہے مگر مالی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنا تعلیمی سلسلہ ختم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مراسلہ کے آخری حصے میں مخیر شخص نے اپنے گھر کا پتا دیتے ہوئے نوجوان طلبا اور طالبات کو ہدایت کی کہ وہ شام ۵ بجے سے رات ۹ بجے کے درمیان اپنی ضرورت کے سلسلے میں براہ راست رابطہ قائم کریں۔"

مراسلہ نگار کے دیئے ہوئے پتے پر تین لڑکے اور دو لڑکیاں پہنچیں انہیں باہر کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ انہیں بتایا گیا کہ "صاحب غسل کر رہے ہیں۔ اس کے بعد چائے پیئں گے۔ پھر آپ لوگوں سے ملاقات کریں گے۔"

تقریباً ساڑھے سات بجے ہمدرد انسان نے اپنی تمام ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد کمرے میں بیٹھے ہوئے ضرورت مند طلبا اور طالبات کو شرف باریابی کا موقع دیا۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ طالبات خاص طور پر پریشان اور متفکر تھیں۔ وہ جب بھی اٹھنے کی کوشش کرتیں صاحب خانہ کا نوکر انہیں یہ کہہ کر بٹھا دیتا۔ "بس صاحب چند منٹوں میں آپ لوگوں کو بلائیں گے۔ تھوڑی دیر اور انتظار کر لیں!" لڑکیوں نے اس پانچ منٹ کے انتظار میں گھنٹوں گذار دیئے، بالآخر انتظار کی طویل گھڑیاں ختم ہوئیں اور صاحب خانہ نے باری باری لڑکے اور لڑکیوں کو اندر بلایا۔ پانچ ضرورت مندوں میں سے تین کو چلتا کر دیا گیا۔ باقی ایک صاحب زادے اور ایک طالبہ کو روک لیا گیا۔

"صاحب نے آپ دونوں کی ... کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ دونوں بڑے خوش قسمت ہیں" نوکر نے انہیں خوش خبری سنائی۔ دونوں کو محسوس ہوا جیسے دنیا جہاں کی نعمت مل گئی۔ ان کی مصیبت اور پریشانی کے دن ختم ہو گئے۔ صاحب خانہ نے اسی وقت دونوں کو تین تین سو روپے کا چیک کاٹ کر دیا۔ اور طالبہ کو اتوار کے روز اپنے گھر بلایا۔ جب وہ دونوں رخصت ہوئے تو ان کے دل اس مخیر اور بے لوث آدمی کے لئے دھڑک رہے تھے۔ دنیا میں ابھی ایسے انسان موجود ہیں جو کسی لالچ کے بغیر انسانیت کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں

اتوار کے دن نوجوان طالبہ حسب وعدہ اس مخیر اور ہمدرد انسان کے گھر پہنچ گئی۔ اس دنیا میں اس کی ایک ماں اور ایک چھوٹے بھائی کے سوا دوسرا کوئی نہیں۔ گھر کے حالات ایسے نہیں کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔ امسال وہ انٹر کا امتحان دینے جا رہی تھی چار ماہ سے وہ کالج کی فیس نہ دے سکی تھی۔ ساتھ امتحان کی فیس بھی داخل کرانی تھی وہ بے حد پریشان تھی وہ اپنے تمام رشتہ داروں کے گھر کے دروازے کھٹکھٹا چکی تھی۔ مگر ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ کہیں سے فیس کی رقم نہ مل سکی۔ اس کی ساری محنت اکارت جانے والی تھی سنہرا مستقبل مایوسی اور تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا کہ اچانک اخبار کے کالم میں اس ہمدرد انسان کی پیش کش پر نظر پڑ گئی۔ اسکول اور امتحان کی فیس ادا کرنے کے بعد بھی اس کے پاس کچھ رقم بچ گئی۔ اس کے دل میں اس ہمدرد انسان کے لئے بے پناہ عقیدت پیدا ہو چکی تھی۔

ناظم آباد کے قدرے نیم خاموش علاقہ میں اس ہمدرد انسان کا ایک خوبصورت بنگلہ ہے وہ رکشہ میں وہاں گئی۔ ٹھیک وقت پر پہنچ گئی۔ شام کے جھٹپٹے میں صاحب خانہ لان میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور اسے اپنے پاس بٹھا کر چائے پلائی، چائے نوشی کے دوران اس کے گھر کے حالات کرید کرید کر پوچھتے رہے۔ اور گاہے گاہے بڑے پرتپاک انداز سے ہوں۔ ہاں۔ اچھا۔ کہتے رہے۔ نوجوان طالبہ ایک ہمدرد انسان کو اپنے قریب دیکھ کر جذبات سے لبریز ہو گئی۔ اور وہ جن حالات سے گذر رہی تھی، انہیں کتاب کی طرح دہرا گئی۔ متمول آدمی نے اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں تمہارے حالات سے بے حد متاثر ہوا یقین کرو۔ ایسی باہمت لڑکیاں بہت کم ہیں۔ جو حالات کا اس طرح سے مقابلہ کرتی ہیں۔ میں تمہاری مدد ہر قدم پر کروں گا۔"

نوجوان طالبہ نے بتایا۔ اس قسم کی ملاقاتوں کا سلسلہ خاصا طویل رہا۔ اس دوران اس ہمدرد انسان کے ہاں اس نوجوان طالب علم سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی مگر یہ ملاقات سرسری رہتی۔ ایک دن صاحب خانہ سے بات چیت میں خاصی دیر ہو گئی باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ ہم دونوں اٹھ کر اندر آ گئے کمرے کی تنہائی میں پہلی بار میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر میں نے تمام وسوسے اور

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

SINFUL CHARITY!

KARACHI, July 28 (PPI): Some fradulent persons are enticing away young boys and girls through promises of offering them money for their education and other needs.

And when unsuspecting young boys and girls approach these people for assistance they are asked to fulfil their sinful demands before the money is given.

These so-called philanthropists often put an advertisement in newspapers or write a letter to the editor. In other cases they are on the lookout for boys and girls writing to newspapers and magazines seeking assistance for their education, marriages etc.

الفتح

مشرقی پاکستان سے ایک خط

'شیخ مجیب نے آخری وقت تک علیحدگی کا مطالبہ نہیں کیا تھا' پروفیسر غلام اعظم کا انکشاف

'کالعدم عوامی لیگ سے جماعتِ اسلامی کی دَرپردہ سازباز کا ثبوت'

خصوصی وقائع نگار' ڈھاکہ

حکومت پاکستان کی جانب سے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی قیادت میں چلنے والی علیحدگی پسندی کی تحریک کے بارے میں قرطاس ابیض شائع کیا جاچکا ہے جس میں ملک کے مشرقی حصے کو پورے پاکستان سے الگ کرنے کی عوامی لیگی سازش کا انکشاف کیا گیا ہے لیکن اس میں ان سیاسی پارٹیوں کے کردار اور سرگرمیوں کے بارے میں کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی جنہوں نے عوامی لیگ کی سازش میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر حصہ لیا ہے آج وقت آگیا ہے کہ ہم مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کی تحریک میں دوسری دائیں بازو کی جماعتوں کے کردار کا بھی بغائر جائزہ لیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس ملک دشمن تحریک میں دائیں بازو کی کس جماعت نے کیا رول ادا کیا ہے۔ اگر ہم ۲۵ مارچ سے قبل کی سیاسی سرگرمیوں کا جائزہ لیں۔ تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس تحریک میں عوامی لیگ کے بعد جس سیاسی جماعت نے سب سے اہم کردار ادا کیا تھا وہ مشرقی پاکستان کی جماعت اسلامی ہے۔

جماعت اسلامی پاکستان کی وہ سیاسی جماعت ہے جس نے عام انتخابات سے دو سال قبل پاکستان میں مذہب کے نام پر "کفر و اسلام" کی جنگ شروع کی تھی۔ اور ان تمام لوگوں کو مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا تھا جو ان سے سیاسی و نظریاتی اختلافات رکھتے تھے اس سلسلہ میں اس نے سب سے پہلے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان کے قومی اخبارات پر قبضہ کیا اور سوشلسٹوں کے خلاف مہم شروع کرنے کے نام پر ان تمام ترقی پسند، آزاد خیال اور روشن خیال لوگوں کے خلاف جدوجہد شروع کی جو سچی جمہوریت کے قیام کے لئے سماجی انصاف اقتصادی مساوات اور معاشی استحصال کے خاتمے کو ضروری سمجھتے تھے۔ جماعت اسلامی نے ان لوگوں کو ایک سرے سے سوشلسٹ قرار دیا اور انہیں اسلام اور پاکستان دشمن ٹھہراتے ہوئے ان کے خلاف وسیع پیمانے پر جدوجہد شروع کر دی جماعت اسلامی نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اسلام کو بطور حربہ استعمال کیا اور ان تمام لوگوں کے خلاف فتویٰ جاری کروایا۔ جو کسی نہ کسی طرح بائیں بازو کے رجحانات رکھتے تھے۔

انتخابات سے چند ماہ قبل جماعت نواز حلقوں کی جانب سے کھلم کھلا اعلان کیا گیا کہ ان تمام لوگوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا جو قوم پرست اور سوشلسٹ جماعتوں کو ووٹ دیں گے۔ ان کا اشارہ واضح طور پر پاکستان پیپلز پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی اور ولی گروپ) اور عوامی لیگ کی جانب تھا۔ انتخاب سے قبل

صدر یحییٰ نے یکم مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا تو کالعدم عوامی لیگ کی طرح جماعتِ اسلامی نے بھی اس کی ساری ذمہ داری بھٹو پر عائد کردی

یہی وہ پارٹیاں تھیں جو اقتصادی مسائل کے سلسلہ میں سوشلسٹ پروگرام رکھتی تھیں۔ آخرالذکر جماعت یعنی عوامی لیگ اگرچہ ایک قوم پرست جماعت تھی لیکن اس نے جمہوری سوشلزم کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔

اور وہ اس دور میں مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کی سب سے بڑی مخالف پارٹی تھی اس لئے جماعتِ اسلامی کے لئے ضروری تھا کہ وہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور ولی نیپ اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور بھاشانی نیپ کے خلاف جدوجہد کرتی چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

مغربی پاکستان میں اس نے ایک سازش کے تحت قومی اخبارات پر قبضہ کرنے کے بعد پیپلز پارٹی ولی نیپ اور دوسرے ترقی پسند عناصر کے خلاف وسیع پیمانے پر مہم شروع کی۔ لیکن مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کو اپنے مقاصد میں سخت ناکامی ہوئی۔ کیوں کہ مشرقی پاکستان کے اخبارات اسلام کے نام پر عوام کو دھوکہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے حتیٰ کہ مولانا اکرم خان مرحوم کے اخبار "آزاد" (ڈھاکہ) نے بھی اسلام کا نام لے کر رائے دہندوں کو گمراہ نہیں کیا حالانکہ روزنامہ "آزاد" کی اسلام دوستی اور مذہب پرستی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے مشرقی پاکستان میں اخبارات پر قبضہ کرنے کی کوششیں ناکام ہونے کے بعد جماعت اسلامی نے مشرقی پاکستان سے اپنا نجی اخبار "سنگرام" (جدوجہد) جاری کیا جس نے روز اول سے پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے خلاف زہر افشانی شروع کر دی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ انتخاب کے فوراً بعد عوامی لیگ کے بھاری اکثریت سے کامیاب ہوتے ہی جماعتِ اسلامی اور اس کے اخبار "سنگرام" نے عوامی لیگ کے بارے میں اپنا سیاسی موقف بدل دیا۔

انتخاب سے قبل ہی جماعت اسلامی نے مشرقی پاکستان کے بارے میں دوغلی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایئے کہ جب ون یونٹ کے ختم ہونے کے بعد مشرقی پاکستان کا نام رکھنے کا سوال

الفتح

پروفیسر غلام اعظم کو "بنگلہ دیش" کے لفظ پر تنقید ناگوار گزری

پیدا ہوا تو عوامی لیگ کی جانب سے مشرقی پاکستان کا نیا نام "بنگلہ دیش" رکھنے کی تجویز پیش کی گئی جس کی مشرقی پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے فوری طور پر تائید کی اس پر حسب معمول مغربی پاکستان جماعت اسلامی کے لیڈر محمود اعظم فاروقی نے سخت اعتراض کیا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان جماعت اسلامی کے امیر پروفیسر غلام اعظم نے جناب فاروقی کے اعتراض کو غلط اور مہمل قرار دیتے ہوئے مشرقی پاکستان کا نیا نام "بنگلہ دیش" رکھنے کی پر زور حمایت کی۔ ایک سیاسی جماعت کے اندر بنگلہ دیش کے نام پر اختلاف کافی دلچسپ اور قابل ذکر ہے۔ مشرقی پاکستان جماعت اسلامی کے امیر پروفیسر غلام اعظم کی اس سیاسی موقع پرستی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مشرقی جماعت اسلامی انتخاب میں حصہ لینے والی تھی اور اسے اندیشہ تھا کہ اگر وہ مشرقی پاکستان کا نیا نام "بنگلہ دیش" رکھنے کی حمایت نہیں کرے گی، تو وہ عوام میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکے گی۔ اور انتخاب میں اس کی کامیابی مشکوک ہو جائے گی۔ اگر جماعت اسلامی کے رہنما یہ سمجھتے ہیں کہ عوام کی یادداشت بہت کمزور ہے اور وہ ماضی قریب میں جماعت کی تمام کرتوتوں کو بھول چکے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ جماعت اسلامی کی سیاسی قلابازی اور موقع پرستی کا ریکارڈ آج بھی مشرقی پاکستان کے انگریزی، اردو اور بنگلہ اخبارات کے فائیلوں میں محفوظ ہے۔

انتخابات سے قبل جماعت اسلامی شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی جماعت کو بھارت کا ایجنٹ قرار دیا کرتی تھی چنانچہ اس کے اخبار "سنگرام" نے انتخاب سے چند دن قبل یہ سنسنی خیز انکشاف کیا تھا کہ "مشرقی پاکستان کی آزادی کا منصوبہ نئی دہلی میں تیار کیا جا چکا ہے اور اس سلسلہ میں پرچم کا نقشہ بھی طے پا چکا ہے۔" لیکن انتخاب کے بعد جماعت اسلامی نے فوراً اپنی سیاسی حکمتِ عملی بدل لی۔ اور عوامی لیگ کی علیحدگی پسندی پر اعتراض کرنے کے بجائے صرف پیپلز پارٹی کو تنقید وں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا جیسے پیپلز پارٹی عوامی لیگ سے زیادہ خطرناک پارٹی ہو۔ پیپلز پارٹی کی مخالفت کی بنیادی وجہ جماعت اسلامی کی بھٹو دشمنی تھی چنانچہ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد جب سے شیخ مجیب نے "نام نہاد" "تحریک عدم تعاون" شروع کی تھی، مشرقی پاکستان جماعت اسلامی نے پیپلز پارٹی کے ہر سیاسی مؤقف کی مخالفت کرتے ہوئے عوامی لیگ کی تائید و حمایت شروع کر دی تھی۔ چنانچہ یکم مارچ کو جب صدر یحییٰ نے قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا تو عوامی لیگ کی طرح مشرقی پاکستان جماعت اسلامی نے بھی اس کی ساری ذمہ داری جناب بھٹو پر عائد کر دی اور یکم مارچ کے بعد ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان میں جو لوٹ مار، قتل و غارت اور سیاسی ہنگامہ اور فساد ہوا اس کے لئے عوامی لیگ کے بجائے پیپلز پارٹی اور صرف پیپلز پارٹی کو مورد الزام ٹھہرایا اور اس کے اخبار "سنگرام" نے عوامی لیگ کی نام نہاد تحریک عدم تعاون کی کھل کر حمایت کی۔ صرف اتنا ہی نہیں ، مارچ کو رمنا ریس کورس کے جلسہ عام میں شیخ مجیب الرحمٰن

جماعتِ اسلامی کا ترجمان

"سنگرام" انتخابات کے بعد

مجیب الرحمٰن کا

ناقوس بجا رہا

کی جانب ، مارشل لاء ختم کرنے اور تمام اختیارات شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی پارٹی کو منتقل کرنے کا مطالبہ کرنے کے بعد سے جماعت اسلامی نے دائیں بازو کی دوسری جماعتوں کی طرح مارشل لاء فوراً اٹھانے اور شیخ مجیب الرحمٰن کو اختیارات منتقل کرنے کے مطالبے کی حمایت کرنی شروع کر دی۔ "سنگرام" نے "پیپلز پارٹی" پر الزام عائد کیا کہ وہ غیر مشروط طور پر قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت سے احتراز کر کے ملک کی سالمیت اور اتحاد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ساتھ ہی "سنگرام" نے صدر یحییٰ سے مطالبہ کیا کہ دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ صدر موصوف فوراً مارشل لاء کے خاتمے کا اعلان کر دیں اور تمام اختیارات شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی پارٹی کے حوالے کر دیں۔ "سنگرام" نے شیخ مجیب الرحمٰن کی حمایت میں جو اداریے لکھے وہ آج بھی ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ یہ درست ہے کہ انتخاب سے قبل جماعت اسلامی نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر عوامی لیگ کی سیاسی مخالفت اور مزاحمت کی تھی کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا اور نہ انتخاب میں اس کی کامیابی ممکن تھی لیکن انتخاب کے بعد قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں عوامی لیگ کو بھاری اکثریت حاصل ہوتے ہی اس نے عوامی لیگ کی مخالفت قطعی ترک کر دی اور نہ صرف اس کی ملک دشمن سرگرمیوں (خصوصاً علیحدگی پسندانہ رجحان) کی جانب سے آنکھیں بند کر لیں بلکہ اس نے صدر سے شیخ مجیب الرحمٰن کو غیر مشروط طور پر اختیارات منتقل کرنے کا مطالبہ کر کے علیحدگی پسندوں کی کھل کر حمایت کی۔ اگر جماعت اسلامی ایک اصول پرست اور سچی اسلامی جماعت ہوتی تو وہ اپنے سیاسی اصول اور نصب العین کے تحت ہرگز علیحدگی پسندوں اور ملک دشمن عناصر سے سمجھوتہ نہیں کرتی اور نہ اپنی حمایت و تائید سے علیحدگی پسندوں کے ہاتھ مضبوط کرتی لیکن جماعت اسلامی اپنے قیام کے اولین دنوں سے موقع پرست رہی ہے اور ہر لمحہ اس کی پالیسی اور حکمت عملی بدلتی رہی ہے۔ جماعت اسلامی کے مقابلہ میں پیپلز پارٹی اور قیوم مسلم لیگ کہیں زیادہ با اصول اور باوقار سیاسی جماعتیں ثابت ہوئی ہیں۔ جنہوں نے زبردست سیاسی دباؤ کے باوجود عوامی لیگ کی ملک دشمن اور علیحدگی پسند پالیسی کی حمایت نہیں کی۔

آج جب کہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے اور اس طرح پاکستان کو تباہ کرنے کی عوامی لیگی سازش منظر عام پر آ چکی ہے جماعت اسلامی کی جانب سے اس بارے میں بڑے بڑے دعوے کئے جا رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان جماعت اسلامی کے امیر پروفیسر غلام اعظم کی جانب سے شیخ مجیب الرحمٰن کو معصوم اور "معمولی نوعیت کا سیاسی مجرم" ثابت کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں جماعت اسلامی کے ترجمان کا کہنا ہے کہ "شیخ مجیب الرحمٰن کمیونسٹوں کے گھیرے میں اس بری طرح الجھ گئے تھے اور ان کے لئے اپنے طے کردہ راستے پر چلنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ان کے تین قریبی معتمد ساتھی نذر الاسلام۔ ڈاکٹر کمال اور تاج الدین کٹر کمیونسٹ تھے۔ وہ شیخ صاحب کے گرد ایسا جال بن چکے تھے کہ شیخ صاحب کے لئے اس کے تار کو توڑنا محال تھا" (ملاحظہ ہو اداریہ بعنوان "عزم و عجلت کی ضرورت" "ہفت روزہ" "ایشیا" لاہور مورخہ ۲۷ جون ۱۹۷۱ء)

جماعتِ اسلامی کے نزدیک موقع پرستی اور مصلحت پسندی کا نام سیاست ھے

جماعت کا ترجمان "ایشیا" (لاہور) یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ علیحدگی پسندی کے سلسلہ میں جو کچھ کیا دھرا ہے وہ صرف کمیونسٹوں (بقول اس کے نذرالاسلام۔ ڈاکٹر کمال اور تاج الدین) کا کیا دھرا ہے ورنہ شیخ مجیب الرحمٰن تو "اپنے طے کردہ راستے" پر چلنے والے تھے لیکن کمیونسٹوں نے شیخ صاحب کے گرد ایسا جال بن رہا کہ شیخ صاحب کے لئے تار توڑنا محال ہو گیا۔ جماعت اسلامی کتنی چالاکی اور عیاری سے شیخ مجیب الرحمٰن کو پاکستان سے غداری کے ارتکاب جرم سے بچا کر لے گئی، قابل غور ہے رسید نذرالاسلام، ڈاکٹر کمال اور تاج الدین جو کسی حد تک کمیونسٹ تھے اس کا انکشاف جماعت اسلامی کے ترجمان "ایشیا" سے قبل کسی نے نہیں کیا۔ نہ کسی کمیونسٹ دشمن اخبار اور جریدہ نے کیا اور نہ ہمارے صدرِ مملکت نے۔ جب کہ حکومت کی طرف سے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی علیحدگی پسندی کی سازش کے بارے میں تمام تر تفصیلات شائع کی جا چکی ہیں۔

مشرقی پاکستان جماعت اسلامی کے امیر پروفیسر غلام اعظم نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمٰن کو معمولی نوعیت کا سیاسی مجرم قرار دیتے ہوئے کہا کہ علیحدگی پسندی کے اصل مجرم بھاشانی۔ عطاالرحمٰن اور پروفیسر اور مظفر احمد ہیں کیونکہ بقول ان کے "شیخ مجیب الرحمٰن نے آخری وقت تک اپنی کسی تحریر یا تقریر کے ذریعہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا مطالبہ نہیں کیا تھا" بہ الفاظ دیگر اگر پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچانے کے جرم میں کسی پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے تو وہ ہیں مولانا بھاشانی۔ عطاالرحمٰن اور پروفیسر مظفر احمد (شیخ مجیب الرحمٰن نہیں) لیکن جب اخبار نویسوں نے پروفیسر موصوف کی توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کرائی کہ وہ اس طرح شیخ مجیب الرحمٰن کو معصوم قرار دے رہے ہیں۔ تو انہوں نے فوراً اعتراف کیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن بھی غدار ہیں لیکن دوسرے لوگ ان سے بڑھ کر غدار ہیں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پروفیسر موصوف کی نظر میں شیخ مجیب "چھوٹے غدار" اور مولانا بھاشانی "بڑے غدار" ہیں

قائم مقام امیر جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد نے مشرقی پاکستان میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "انتخابات سے کچھ ہی قبل امیر جماعت اسلامی پاکستان مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک انتخابی تقریر میں بجا فرمایا تھا کہ اگر یہاں علاقائی ذہنیت رکھنے والی جماعتیں کامیاب ہو گئیں تو پھر فوج بھی اس ملک کو متحد رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ مولانا مودودی کی دوررس نگاہوں نے جس خطرے سے متنبہ کیا تھا اور جس کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا تھا وہ انتخابات کے چار ماہ کے اندر حقیقت بن کر سامنے آگیا (" ایشیا" لاہور۔ مورخہ ۲۵ / جولائی ۱۹۷۱ء)

سوال یہ ہے کہ انتخاب سے قبل جب جماعت اسلامی کو علم تھا کہ عوامی لیگ اور اس کے لیڈر علاقائی ذہنیت رکھنے والے ہیں اور بقول "سنگرام" شیخ مجیب الرحمٰن بھارت کے ایجنٹ کے طور پر مشرقی پاکستان کو مرکز سے الگ کرنے اور اس طرح پاکستان کی سالمیت کو تباہ کرنے کی سازش کر رہے ہیں تو اس نے انتخابات کے بعد (خواہ انتخاب کے نتائج کچھ بھی کیوں نہ ہوں) شیخ مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کے سیاسی موقف اور مطالبات کی کیوں حمایت کی ؟ کیا اس کی وجہ محض بھٹو دشمنی تھی یا جماعت اسلامی نے خفیہ طور پر عوامی لیگ سے سمجھوتہ کر رکھا تھا ؟ اگر یہ محض بھٹو دشمنی تھی جس کی وجہ سے جماعت اسلامی نے عوامی لیگ جیسے انتہا پسند قوم پرست اور علیحدگی پسند جماعت کی حمایت کرنے میں شرم محسوس نہیں کی تو سوال یہ ہے کہ کیا جماعت اسلامی کے سامنے اصول پرستی کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور محض موقع پرستی اور مصلحت پسندی کا نام سیاست ہے ؟ اور اگر وہ عوامی لیگ کے مطالبات کی حمایت کرنے میں پرخلوص تھی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جماعت اسلامی درپردہ عوامی لیگ کی علیحدگی پسندی کی حامی تھی اور اس نے عوامی لیگ کی علیحدگی پسندی کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے بالواسطہ طور پر کام کیا تھا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو آج پاکستان کے باشعور اور محب الوطن، جماعت اسلامی کے لیڈروں خصوصاً مولانا مودودی سے کر رہے ہیں۔ اگر جماعت اسلامی نے اس سوال کا آج کوئی جواب نہیں دیا تو کل اسے اس سوال کا ضرور جواب دینا پڑے گا۔ اور جب تک ان کی جانب سے جواب نہیں دیا جائے گا۔ عوام انہیں ہرگز نہیں چھوڑیں گے

سیاست کی وجہ سے نوجوان کھلاڑی علاؤ الدّین ضائع ہو رہا ہے

اسکواش کے میدان میں بھارت کی عبرتناک شکست

لطافت علی صدّیقی

نیوزی لینڈ میں عالمی اسکواش چمپیئن شپ کے مقابلوں میں پاکستانی کھلاڑیوں نے اپنے حریف بھارتی کھلاڑیوں کو عبرت ناک شکست دے کر اپنی قوم کو یوم استقلال کے موقع پر ایک یادگار تحفہ پیش کیا ہے۔

اسکواش کی دنیا کے عظیم خانوں میں سب سے چھوٹے تورحم خاں نے ۱۶ منٹ سے کم وقفے میں بھارت کے فوجی افسر وجے پال کی مزاحمت کو ہر طرح سے کمزور کر کے بالآخر اُسے شکست سے ہمکنار کرنے میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیا۔

پاکستانی کپتان آفتاب جاوید نے بھی تورحم خاں کی مثال سامنے رکھتے ہوئے بھارتی کھلاڑی علی اصفہانی کو آسانی سے ہرادیا۔ تیسرا میچ پاکستان کے نمبر ایک کھلاڑی محمد سلیم اور بھارتی کھلاڑی ایس رائے کے درمیان کھیلا گیا۔ جس میں محمد سلیم آخری دو راؤنڈوں میں بھارتی کھلاڑی پر اپنی برتری قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح پاکستان کے کھلاڑی اسکواش کی عالمی چمپیئن شپ میں تیسری پوزیشن پر پہنچ گئے۔ اب ان کا مقابلہ نیوزی لینڈ کے کھلاڑیوں سے ہوگا۔

عالمی اسکواش چمپیئن شپ کا مقابلہ ۸ر اگست سے نیوزی لینڈ کے مقام ہملٹن میں ہو رہا ہے پاکستان کی چار رکنی ٹیم اس میں شرکت کے لئے گئی ہے اسکواش کی دنیا میں کبھی پاکستان پہلی پوزیشن پر تھا۔

اسکواش کا پہلا اور دوسرا عالمی مقابلہ آسٹریلیا اور برطانیہ میں منعقد ہوا تھا ۱۹۶۷ء کی آسٹریلین چمپیئن شپ میں چھ ممالک شریک ہوئے تھے۔ پاکستان پانچویں نمبر پر تھا۔ ۱۹۶۹ء میں اسکواش کا دوسرا عالمی مقابلہ لندن میں ہوا۔ پاکستان کی تیسری پوزیشن تھی۔

نیوزی لینڈ کے تیسرے عالمی مقابلہ میں سات ممالک حصّہ لے رہے ہیں۔ ان میں پاکستان، نیوزی لینڈ آسٹریلیا، برطانیہ، بھارت، متحدہ عرب جمہوریہ اور کنیڈا شامل ہیں۔ چمپیئن شپ کا ٹائٹل آسٹریلیا کے پاس ہے اور وہ اپنے اعزاز کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتا ہے جبکہ پاکستان اس مقابلہ میں دوسری پوزیشن حاصل کرنے میں پر اُمید ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسکواش کے جادوگر ہاشم خان، روشن اور تازہ ترین آفتاب جاوید کے اعلےٰ کھیل کی وجہ سے عالمی چمپیئن شپ کا اعزاز کئی سالوں تک پاکستان کے پاس رہا۔ لیکن ۱۹۶۷ء میں جونا ہیرنگٹن نے چمپیئن آفتاب جاوید کو شکست دے کر پاکستان سے عالمی اعزاز چھین لیا۔ جونا حال ہی میں اسکواش کی دنیا سے غائب ہوا ہے۔ اس کا واقعہ بھی دل چسپ ہے۔ چند ماہ پیشتر جونا ہیرنگٹن جسمانی تربیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے ایک سابق برطانوی اولمپک انھلیٹ کی خدمات حاصل کیں جو ان دنوں کوچ ہے۔ کوچ نے ہیرنگٹن کو اپنے ساتھ قیام کرنے کی اجازت دے دی۔ ہیرنگٹن نے اپنے قیام کے دوران تربیت حاصل کرنے کے علاوہ کوچ کی ۳۲ سالہ حسین وجمیل بیوی سے معاشقہ لڑانا بھی شروع کر دیا۔ کوچ کی بیوی نے لمبے بالوں والے ہیرنگٹن کی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ دونوں میں ساتھ مرنے اور جینے کے عہد و پیمان ہوئے اور خالص مشرقی روایت کی طرح دونوں نے ایک دوسرے سے کہا۔ "اگر ہمارے درمیان کوئی حائل ہوا تو ہم اپنی جان دیدیں گے۔ مگر ایک دوسرے سے جدا ہونا گوارا نہ کریں گے۔

ایک خوشگوار صبح کو جب کوچ کی آنکھ کھلی تو اس کا گھر سنسان پڑا تھا۔ اس نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر اس کی بیوی اور ہیرنگٹن نظر نہ آئے۔ کوچ نیم پاگل ہو گیا۔ وہ ایک ایک کمرے میں اپنی بیوی کو آواز دیتا پھرا۔ اگر گھر میں اس کی بیوی ہوتی تو اس کا جواب دیتی۔ وہ تو ہیرنگٹن کے ساتھ فرار ہو چکی تھی۔ کوچ نے بہت کوشش کی مگر پورے برطانیہ میں اس کی بیوی اور ہیرنگٹن کا نام ونشان تک نہ ملا۔ برطانوی پولیس نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس واقعہ پر پردہ ڈال دیا۔ مگر اسکواش کے بین الاقوامی پاکستانی کھلاڑی کی زبانی مجھے اس واقعہ کا علم ہوا۔

محبت، شادی اور طلاق برطانیہ جیسے ملک میں عام بات ہے۔ برطانیہ جہاں کے سفید فام باشندے اپنے آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ مہذب قوم ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں، یہ واقعہ، نفسِ مضمون میں دراصل اپنی دل چسپی کی وجہ سے آگیا ہے ورنہ میرا روئے سخن تو اسکواش کا عالمی مقابلہ اور پاکستان کے باصلاحیت کھلاڑیوں کی طرف ہے۔

اسکواش کی دنیا میں آفتاب جاوید کی خدمات اچھی خاصی ہیں۔ گو ان میں رفتار اور استقامت کی کمی ہے لیکن ان کا ماضی اس کھیل کے وسیع تجربوں پر مشتمل ہے اس عالمی کھیل میں وہ ہماری امیدوں کے مرکز ہیں محمد سلیم نئے قومی چمپیئن ہیں۔ کیمپ میں خاصی محنت کر کے نیوزی لینڈ گئے ہیں۔ یقیناً وہ اپنے کھیل سے قوم کی توقعات پر پورا اتریں گے۔ پاکستانی اسکواش ٹیم میں تورحم خاں بھی شامل ہیں۔ جو سابق چمپیئن روشن خاں کے صاحبزادے ہیں۔ آخری کھلاڑی "بے بی" ہیں۔ ان کا نام محب اللہ ہے اور پشاور سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس نوجوان کھلاڑی میں بے پناہ صلاحیتیں ہیں اس نے حال ہی میں پہلی بار برطانوی اوپن جونیئر چمپیئن شپ کا مقابلہ جیتا۔ اگر اس کھلاڑی کو جدید طریقہ سے تربیت دی گئی تو یہ یقیناً پاکستان کا ایک گرانقدر اثاثہ ثابت ہوگا۔

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

الفتح کراچی

سردار شوکت حیات جلسہ ختم ہونے کی دعا مانگ رہے تھے

نمائندہ خصوصی

کیمبل پور میں کونسل لیگ کے دو گروپ ہیں شوکت حیات گروپ اور دولتانہ گروپ، پیر صفی الدین مکھڈ دولتانہ صاحب کی نمائندگی کرتے ہیں جب کہ سردار شوکت حیات کی نمائندگی ان کا خیال

کا خاندان کرتا ہے دونوں گروپوں میں پہلے سے کش مکش چلی آرہی ہے۔ فتح جنگ کے ٹکٹ پر پیر مکھڈ نے علیحدگی کی دھمکی دیدی۔ اندرون خانہ لوگوں کا کہنا ہے کہ شوکت حیات نے ہتھیار ڈال دیئے ۲۱ اگست سے چند دن پہلے شوکت حیات گروپ کے ایک مقتدر رکن کو یہ کہتے سنا گیا کہ اگر شوکت حیات اجلاس میں شریک نہ ہوئے تو ہم بھی نہیں آئیں گے۔ مندرجہ بالا حالات کے پس منظر میں کونسل مسلم لیگ کے تحت جلسہ کی کاروائی شروع ہوئی سردار شوکت نے سٹی لیگ کے صدر کو صدارت کرنے کو کہا جب کہ پیر مکھڈ نے ضلع لیگ کے صدر کو کرسی صدارت پر متمکن کر دیا اور اس کے بعد خود تقریر شروع کر دی۔ ان کے بعد میاں دولتانہ آئے اور ایک گھنٹہ بیس منٹ کی تقریر کی کچھ نہ کہنے کے باوجود سب کچھ کہہ گئے۔ مگر تقریر کے دوران ایک دعویٰ کیا بلکہ خان قیوم اور بھٹو صاحب کو چیلنج کیا کہ وہ ثابت کردیں کہ کونسل لیگ نے کسی سطح پر چھ نکات کی حمایت کی ہو۔ جب کہ ان کے سامنے سردار صاحب دانتوں میں انگلیاں دبائے۔ جلسے کے خاتمے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ایک منچلہ اس وقت دبی زبان سے کہہ رہا تھا کہ کیا سردار شوکت کو کونسل لیگ کی طرف سے بولنے کا حق نہیں کہ ان کی حمایت یا مخالفت سے دولتانہ صاحب انہی کے سامنے لاتعلقی کا اعلان کر رہے ہیں۔

لائلپور

سرحد میں مزارعین کی ظالمانہ بیدخلیوں کے خلاف احتجاج

جاذب سہیل

خان ناہید نواز خان قائم مقام چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی تحصیل لائلپور نے ۱۳ جولائی کو تیرہ مزدور کسان اور طالب علم انجمنوں کی طرف سے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے صوبہ سرحد میں جاگیرداروں کے بہیمانہ مظالم کی شدید مذمت کی

انہوں نے جاگیرداروں کی تاریخ کو زیر بحث لاتے ہوئے کہا کہ قیام پاکستان سے قبل یہ کہا جاتا تھا کہ کسانوں کی غربت اور جہالت کا سبب غیر ملکی حکمران اور ہندو سرمایہ دار ہے۔ لہٰذا مزدوروں کسانوں اور مزارعین نے غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے عظیم قربانیوں کا آغاز کیا مگر قیام پاکستان کے بعد ملک کا اقتصادی اور معاشی ڈھانچہ بدستور وہی رہا جو غیر ملکی برطانوی سامراج نے لوٹ کھسوٹ کے لئے قائم کیا تھا۔ اس استحصالی نظام کی بدولت مزدوروں کسانوں کی غربت اور جہالت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ دیہات لوٹ کھسوٹ اور جرائم کا مرکز بن گئے۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی سامراج کے استحصالی ڈھانچے نے ایسے طبقے کو جنم دیا جو ملک و قوم سے غداری کر کے استعماری مفادات کے تحفظ کا نگران بن گیا۔ اس مراعات یافتہ طبقہ میں قبائلی سردار، سابقہ شہنشاہوں کے درباری اور جاگیردار شامل تھے۔ انہیں اراضی کے بڑے بڑے قطعات بطور انعام دیئے گئے اور ان کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ میں سہولتیں مہیا کی گئیں۔ قیام پاکستان کے بعد یہ مراعات یافتہ طبقہ ملکی قیادت کو اپنے ہاتھ میں لینے میں کامیاب ہوگیا اس طبقے نے جاگیرداری سسٹم کو مزید مضبوط کیا اور نوکر شاہی سے گٹھ جوڑ کر کے سرکاری اراضی کے بہت بڑے بڑے قطعات پر قبضہ کر لیا۔

پیپلز پارٹی کے رہنما نے کہا کہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں جاگیرداروں نے مزارعین کو بے دخل کرنا شروع کر دیا ہے لیکن سرحد میں ان ظالمانہ بےدخلیوں کے خلاف احتجاج کرنے والے مزارعین خوانین کی گولیوں کا نشانہ بننا شروع ہوگئے۔ آپ نے کہا کہ



اِدارہ الفتح کی جانب سے

بھٹو کو مبارکباد

پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو مقامی کلینک میں ہرنیا کے کامیاب آپریشن کے بعد اب مکمل طور پر صحت یاب ہو چکے ہیں۔ کلینک میں قیام کے دوران عوام اور پارٹی کے کارکنوں کی بھاری تعداد ان سے ملنے آتی رہی۔ غیر ملکی سفراء میں عوامی جمہوریہ چین کے قونصل الجزائر اور ایران کے سفیر، افغانستان کے قونصل اور امریکہ کے ناظم الامور ان کی مزاج پرسی کے لئے آئے، پاکستان کے رہنماؤں میں مسٹر ممتاز خاں دولتانہ اور جناب ابوالقاسم قابل ذکر ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈروں میں جناب معراج محمد خاں، حاجی قاسم عباس پٹیل، مولانا کوثر نیازی، ڈاکٹر شمیم زین الدین، میجر اکبر خان اور دوسرے رہنما بھی کلینک میں جناب بھٹو کی عیادت کے لئے آئے۔ جناب بھٹو کا آپریشن پروفیسر نصیر اے شیخ نے کیا تھا۔ ادارہ الفتح جناب بھٹو کو ان کی صحت یابی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔



یہ ظلم و تشدد اور مزارعوں پر مسلح حملے انتخابات سے پہلے بھی جاری تھے اور خوانین ہشت نگر رستم ساڑھوم، مندنی، تنگی، مالاکنڈ، سوات اور دیگر قریبی علاقوں میں سینکڑوں مزارعین کو ہلاک و زخمی کر چکے ہیں لیکن اس پر وہاں کی نوکر شاہی نے خوانین اور ان کے غنڈوں کو گرفتار کرنے کی بجائے مزارعین کو جھوٹے مقدمات میں ملوث کر کے جیلوں میں ٹھونس دیا اور ان کی زمینوں پر ہل چلوا دیئے۔

خان ناہید نواز نے کہا کہ انتخابات کے بعد اور اب سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کی چھتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خوانین اور نوکر شاہی نے مزارعین کے خلاف وسیع پیمانے پر وحشیانہ کارروائی شروع کر دی۔ پیپلز پارٹی کے رہنما نے کہا کہ خان قیوم خان کی اطلاع کے مطابق شہید ہونے والے مزارعین کی تعداد اڑھائی سو تک پہنچ چکی ہے۔ اور یہ یاد رہنا چاہیئے کہ علاقہ تنگی کا وڈیرہ اکبر خان جس کی زمین پر مزارعین کے خون سے ہولی کھیلی گئی ہے، وہ مسلم لیگ قیوم لیگ کا ایک ممتاز رہنما ہے۔

خان ناہید نواز نے کہا کہ مارشل لا احکام کو چاہیئے کہ عوامی حکومت کے قیام تک حالات کو پرامن رکھنے کے لئے پاکستان بھر میں مزارعوں کی بے دخلیاں مزارعوں پر خوانین اور جاگیرداروں کا ظلم و تشدد اور ملوں سے مزدوروں کی چھانٹی فوراً اور مکمل طور پر بند کر دی جائے اور مزارعوں اور مزدوروں کی حمایت کے جرم میں سرحد کی جیلوں میں بند سیاسی کارکنوں کو فوری طور پر رہا کیا جائے

مشترکہ پریس کانفرنس میں شرکت کرنے والی انجمنوں اور ان کے نمائندوں میں (۱) خان ناہید نواز، قائمقام چیئرمین پی پی پی تحصیل لائلپور (۲) عبدالرحمٰن نیازی صدر مزدور یونین کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز لائلپور (۳) محمد بخش قائمقام صدر مزدور یونین زینت ٹیکسٹائل ملز۔ لائل پور (۴) محمد سعید نائب صدر مزدور یونین زینت ٹیکسٹائل ملز۔ لائلپور (۵) جاذب سہیل — سیکرٹری ادارۂ فروغ ادب رکن ضلعی تنظیمی کمیٹی پی پی پی ضلع لائل پور (۶) لطیف چوہدری سیکرٹری ضلعی کسان کمیٹی۔ لائلپور (۷) محمد مختار نائب صدر انجمن کاشتکاران گنا ریزرو ایریا کریسنٹ شوگر ملز۔ لائلپور (۸) حاجی غلام مصطفےٰ صدر نیشلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن لائلپور (۹) ستار حیدر سیکرٹری۔ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن لائل پور (۱۰) عزیز احمد صدر انجمن لوائے طلبا۔ لائلپور (۱۱) مسٹر پیٹرک کرسچین سٹوڈنٹس آرگنائزیشن۔ لائلپور (۱۲) بابو محمد شریف انجمن مزارعین ضلع لائل پور (۱۳) مشتاق ساتھی سیکرٹری پنجابی پرھیا۔ لائل پور اس کے علاوہ حلقہ فکر و دانش۔ لائلپور اور جمعیت ترویج التعلیم۔ لائلپور کے نمائندوں نے بھی شرکت کی

چین میں

روزگار بڑھ گیا

مزدور کم پڑ گئے

صفحہ ۹ سے آگے

اب ان کے ہاں بھاری صنعتیں بھی ہیں۔ ٹیکسٹائل بھی اور کیمیکل صنعتیں بھی۔ یہ سب کچھ انہوں نے اپنے افراد، اپنے محنت کشوں، اپنی تکنیک اور اپنے خام مال سے حاصل کیا ہے۔ اب وہ اقتصادی طور پر حقیقتاً آزاد اور خود کفیل ہو چکے ہیں۔ بلکہ شمالی کوریا کی ترقی میرے خیال میں ایشیا اور افریقہ کے لئے ایک مثال ہے۔ ہمیں یقیناً ان کی ترقی پر رشک آ رہا ہے۔"

پھر عظیم عوامی جمہوریہ چین کی بات چلی تو وہ کہنے لگے کہ "وہاں ہم نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس نے لباس نہ پہن رکھا ہو۔ اگرچہ سادہ ہی۔ اور جو بے کار ہو۔ چین نے زبردست ترقی کی ہے۔ چین کے لوگوں کے چہرے اطمینان اور بشاشت سے چمکتے ہیں۔ گلیوں میں ایک سکون ہے۔ خوشدلی ہے۔ سب سے زیادہ متاثر کرنے والی حقیقت عوام کی خوشحالی اور چہروں پر اطمینان کی جھلک ہے جو دنیا میں بہت کم قوموں کو نصیب ہے۔ یہ یقیناً ان کے مقصد کی لگن کا کرشمہ ہے۔ ہم نے پیکنگ، شنگھائی اور دوسرے شہروں میں جو دیکھا وہ چینی ماہرین کی عظیم اقتصادی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ ہم "مایون" کے عظیم بند کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ دو برس میں اتنا بڑا عظیم بند بنانا اور خالص چینی ماہرین اور چینی تکنیک کی مدد سے یہ یقیناً چینیوں کا ہی کمال ہے۔ ہم نے شنگھائی کے لاکھوں عوام میں سے کسی کو بے کار نہیں دیکھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ چین کی منصوبہ بندی کے ماہرین نے بے روزگاری ختم کرنے کے لئے ایسی منصوبہ بندی کی کہ اب وہاں روزگار بڑھ گیا ہے۔ مزدور کم پڑ گئے ہیں۔ وہاں کے تمام عوام کام سے لگ گئے ہیں اور اب انہیں مزید مزدوروں کی ضرورت ہے۔ چین نے یہ ترقی بھی اپنے ماہرین اور اپنے خام مال کی مدد سے کی ہے۔ انہوں نے باہر سے کوئی مدد نہیں لی ہے۔ ایشیا کی دوسری اقوام کو بھی یہ سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ غیر ملکوں کی امداد کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی قوت کو استعمال کریں۔ تاریخ بتائے گی کہ کچھ عرصے بعد چین ہر شعبے میں خود کفیل ہو جائے گا۔"

اتنے میں پتہ چلا کہ پرواز تیار ہے۔ میں نے چلتے چلتے وزیر خارجہ سے مسٹر بھٹو کی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اگر ہسپتال میں نہ ہوتے تو آپ سے ملنے آتے۔ انہوں نے شکریہ ظاہر کیا اور کہا کہ "میں بھی ان سے ضرور ملتا مگر وقت کم تھا۔" جواں سال بوتفلیقہ کے تمام ساتھی بھی جواں سال تھے اور یہ ۲۲ نوجوان الجزائر کی نہایت اہم شخصیتیں ہیں ان کی جوانی اس بات کی شاہد ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد ممالک کی تقدیر کا فیصلہ اب نوجوان قیادت ہی کر سکتی ہے۔

ان کے سفیر سے میری ملاقات جو ایک روز پہلے ہوئی تھی اس سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ الجزائر کے عوام پاکستان کے عوام کی خوشحالی کے لئے بڑی فکر رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان اپنے سیاسی بحران پر قابو پالے اور اقتصادی طور پر خوشحال ہو۔ الجزائر کے سفیر نے پاکستان کو ایک برادر قوم قرار دیتے ہوئے کہا کہ "الجزائر کے عوام پاکستانی عوام کے موجودہ بحران پر بالکل اسی کرب سے گزر رہے ہیں جس سے پاکستانی عوام دوچار ہیں اور وہ سوچتے ہیں کہ کاش وہ آپ کی مدد کر سکتے۔" انہوں نے کہا کہ الجزائر بھی ایک اسلامی ملک ہے اس نے اقتصادی خوشحالی سوشلسٹ نظام معیشت کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ "پاکستان سے ثقافتی اور اقتصادی تعلقات میں اضافہ ہو۔ انہوں نے یقین ظاہر کیا کہ پاکستان کے عوام یقیناً اپنے سیاسی اور اقتصادی بحران پر قابو پالیں گے۔"

قارئین کہتے ہیں



باباے اردو کے کفن فروش

لاہور کے ایک ہفت روزے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ایک خط کی فوٹو کاپی شائع ہوئی ہے جو غالباً ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو لکھا گیا تھا۔ میں اس کے مندرجات پر کوئی بحث اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ وہ خط ڈاکٹر سید عبداللہ اور بابائے اردو کے خطوں کے جواب میں لکھا گیا۔ گمان اغلب ہے کہ ہر دو خطوط بھی نجی نوعیت کے ہوں گے جن کے جواب میں عبادت صاحب نے بھی نجی خط لکھا تھا اور آخری جملے سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے جس میں اس خط کو ضائع کر دینے کی درخواست کی گئی ہے۔ اس لئے جب تک متذکرہ خطوط کا سراغ نہیں لگ جاتا کوئی فیصلہ قبل از وقت ہوگا۔ اور فی الحال اس امر کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ اورینٹل کالج کے پرنسپل کو اس کے عہدے سے ہٹانے کے لئے جو مذموم ہتھکنڈے استعمال کئے جا رہے ہیں اور (نعوذ باللہ) مالکِ یوم الدین بن کر ۱۳۹۱ھ میں ہی ایک مسلمان کو کافر اور اشتراکی ثابت کرنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے اس پر رائے زنی کی جائے۔ اس لئے کہ یہ طبقہ واری منافرت اور صوبائی تعصب پھیلانے کی کوشش کی ہے جس کا سدباب کرنا اور قرار واقعی سزا دینا حکومت اور مارشل لاء کا کام ہے۔

سر دست مجھے انجمن ترقی اردو کی گرانٹ سے تنخواہ لینے والوں اور اس کی مطبوعات پر نمایاں نام چھپوانے والوں سے یہ پوچھنا ہے کہ انہوں نے بابائے اردو کے ذاتی ریکارڈ اور کتب خانہ خاص کی کتابوں کو محفوظ رکھنے کے کیا انتظامات کئے ہیں؟ اور اگر انہوں نے کوئی انتظام کیا ہے تو وہ منتظم کون صاحب ہیں۔ جنہوں نے بابائے اردو کا خط ڈاکٹر عبادت بریلوی کے "پیشہ ورانہ مخالفین" کے ہاتھوں بیچا ہے

میں انجمن کے ذمہ داران اور محکمہ تعلیم حکومتِ پاکستان کے اربابِ حل و عقد سے پُر زور استدعا کرتا ہوں کہ اس معاملہ کی تحقیقات کریں اور ان کفن فروشوں کو قرار واقعی سزا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ تحقیقات سے صرف متذکرہ خط کے ہی نہیں بلکہ بابائے اردو کے ذاتی ملکیتی مخطوطے اور نایاب کتب کے سرقے اور فروختگی کا بھی پتہ چل جائے گا۔

مُحِبّ قریشی ۶۹۲/۵ لیاقت آباد کراچی

کچھ ہماری بھی سُنیئے

آپ کے رسالے میں ایک مضمون "یہاں چھٹی کے دن بھی کام لیا جاتا ہے" کے عنوان سے پڑھا۔ مندرجہ بالا مضمون حقائق سے بہت دور ہے۔ حقیقت مندرجہ ذیل ہے:

مارچ ۱۹۷۰ء میں ہم لوگوں نے ایک یونین تشکیل دی جبکہ اس فیکٹری میں ایک پاکٹ یونین موجود تھی۔ ہم نے قانون کی رُو سے ان سے باقاعدہ ریفرنڈم جیتا اور دو سال کے لئے سودے کاری کے ایجنٹ مقرر ہوتے اس کے بعد ہم نے بہت اچھی شرائط پر مالکان سے ایک معاہدہ کیا۔

مذکورہ مل میں آٹھ گھنٹے کام ہو رہا ہے اور طے شدہ تمام مطالبات ہمیں مل رہے ہیں جہاں تک اتوار کو کام کرنے کا تعلق ہے تو بعض چھٹیاں ایسی ہوتی ہیں جو نئین دن تک پڑتی ہیں اور تنخواہ صرف ایک یا دو دن کی ملتی ہے ایسی صورت میں ہماری یونین نے مالکان سے یہ طے کر لیا ہے کہ اتوار کو مل چلایا جائے اور اجرت قانون کے مطابق دی جائے۔ تاکہ مزدور کی اس یوم کی اجرت کم نہ ہو سکے۔ یہاں پر کسی ملازم کو برطرف نہیں کیا گیا اور اگر کبھی ایسا ہوتا ہے تو ہم باقاعدہ صنعتی عدالت میں مقدمہ لڑتے ہیں۔

(جنرل سیکرٹری محمد رفیق)

العظمت لمیٹڈ ایمپلائز یونین رجسٹرڈ نمبر ۱۱۷۹

ان کے پاس ایک تیسری کمپنی بھی ہے

سالنامہ کے کالم "جہاں جائے گا انہیں پائے گا" میں ۲۲ خاندانوں کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں ۲۱ خاندان "فتح" میں دو کمپنیاں درج کی گئی ہیں۔ اس خاندان کی ایک تیسری کمپنی تالپور ٹیکسٹائل ٹنڈو محمد خاں میں ہے۔ یہ کارخانہ پہلے میر غلام علی خاں تالپور کے پاس تھا اب اس خاندان نے خرید لیا۔

پرویز حیدر آباد

سُنو! آواز آرہی ہے

میں الفتح کا ایک پرانا قاری ہوں۔ آپ کا پرچہ پاکستان کے غریب عوام کی ترجمانی کرتا ہے۔ اتنا اچھا سالنامہ نکالنے پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ ۲۲ خاندان والا مضمون پڑھ کر پہلی بار ان کے بارے میں پوری معلومات حاصل ہوئیں۔ تازہ شمارہ میں مسلم لیگ کے بارے میں وائٹ پیپر اور ضیاء سرحدی کا مضمون بہت پسند آیا۔ ادھر چند ہفتوں سے آپ نے "سنو آواز آرہی ہے" کا جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے وہ بہت اثر انگیز ہے۔ ہمارے ملک کے سرمایہ دار اور جاگیردار عوام کو دھوکا دینے کے لئے ہمیشہ اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کی تعلیمات کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ "سنو آواز آرہی ہے" ان کے خلاف ایک للکار ہے، سچ کی آواز ہے۔ آپ نے بڑا اچھا کیا کہ اسلام کی تعلیمات کو اتنے مؤثر طریقہ سے پیش کرنا شروع کر دیا۔ یقین کیجئے آپ کے پرچے میں اس طرح کی سوچ کی کمی محسوس کرتا تھا، جواب پورا ہو گیا۔ الفتح کے ایک مستقل قاری کی حیثیت سے اس نئے سلسلہ پر مبارکباد دیتا ہوں۔

(محمد علیم الدین لائلپور)

کہیں آپ بھی مخیّر حضرات کے جھانسے میں نہ آجائیں!

صفحہ ۲۶ سے آگے

شکوک اپنے دل سے نکال دیئے اتنے اچھا انسان کے بارے میں اس قسم کی باتیں سوچنا بدترین گناہ ہے میں اپنے خیالوں میں گم تھی کہ اچانک میں اپنے ہاتھوں پر کسی دوسرے ہاتھوں کے لمس سے چونک اٹھی۔ اجنبی ہمدرد میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دبا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جہاں ہروقت مجبور انسانوں کے لئے ہمدردی اور شفقت کا جذبہ موجزن رہتا۔ اس وقت غائب تھا اس کی جگہ ایک لالچی اور انتہائی قابل نفرت چمک تھی اس کی سانسیں بھاری ہو رہی تھیں۔ اور وہ بے ربط جملے بول رہا تھا۔ وہ جملے کیا تھے۔ بس پگھلا ہوا سیسہ تھا جو میرے کانوں میں ٹپاٹپ گر رہا تھا۔ اس انسان دوست کی انسان دوستی کا بھرم کھل گیا تھا انسانیت سے میرا ایمان اٹھتا جا رہا تھا۔ پوری کائنات اچھے انسانوں سے خالی اور محض ڈھکوسلہ نظر آرہی تھی میں وہاں سے کس طرح گرتی پڑتی باہر نکلی اور کیسے اپنے گھر محمود آباد پہنچی، یہ ایک الگ داستان ہے۔ اس واقعہ سے چند روز بعد مجھے اسی نوجوان طالب علم سے ریگل صدر میں ملاقات ہو گئی۔

اس نے مجھے بتایا۔ آپ وہاں نہ جایا کریں۔ وہ اچھا انسان نہیں ہے ہم جیسے مجبور طالب علموں کو اس بہانے پھانس کر وہ اپنی مذموم خواہشات کا شکار بناتا ہے۔ اس کا راز کھل گیا۔ میں نے اس کے یہاں جانا چھوڑ دیا۔ آپ بھی نہ جایا کریں۔"

طالبہ نے کہا۔ "ایسے ننگ انسانیت کے خلاف تو کارروائی ہونی چاہئے۔"

طالب علم نے جواب دیا۔ "اس میں ہماری اور آپ جیسی مجبور طالبات کی بھی رسوائی ہو گی۔ عدالت کے کٹہرے میں وکیلوں کے الٹے سیدھے سوالات کا جواب دینا آسان نہ ہو گا۔ اور پھر وہ متمول آدمی ہے۔ اثر و رسوخ بھی رکھتا ہو گا۔ پتہ نہیں وہ کیا کر بیٹھے"۔

یہ کسی افسانے کا واقعہ نہیں ہے، بلکہ کراچی جیسے بڑے شہر کا حقیقی واقعہ ہے۔ اس کی خبریں بھی چھپ چکی ہیں کہ بعض عیاش طبع افراد اس قسم کے ا... یا مراسلہ چھپوا کر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو پھانستے ہیں اور پھر انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں وہ اخبارات اور جرائد میں ایسی تحریروں کی تلاش میں بھی رہتے ہیں۔ جن میں لڑکے اور لڑکیاں مخیر حضرات سے تعلیم یا شادی بیاہ یا دوسری ضرورت کے لئے مالی معاونت کی اپیل کرتے ہیں ایسے انسان دوست بظاہر انسانیت کے نام پر اپنی دولت لٹانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مگر درپردہ ان کا مقصد نوجوان لڑکے اور لڑکیوں سے قریب ہو کر ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا ہے۔ ان میں سے چند طلبا اور طالبات اپنے بے پناہ مسائل اور گھریلو الجھنوں سے مجبور ہو کر ان کی خواہشات کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ رسوائی کے ڈر سے پولیس یا اپنے والدین کو اس بات کی اطلاع نہیں دیتے۔

بقیہ:- کھیل

ہمارے دوسرے کھیلوں کی طرح اسکواش بھی سیاست کا شکار ہے۔ علاؤ الدین جس نے گزشتہ سال برٹش اوپن ٹائٹل جیتا تھا، اسے کھیل کے عہدے داروں نے اپنی سیاست میں کچھ اس طرح استعمال کیا کہ وہ چندماہ بیشتر کراچی میں منعقد ہونیوالی قومی اسکواش چیمپئن شپ میں شرکت نہ کر سکا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کیمپ کے تربیتی پروگرام میں بھی شامل نہ ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی ٹیم میں اُسے منتخب نہیں کیا گیا۔

اس تنازعہ کی ابتدا اس وقت ہوئی جب پاکستان اسکواش راکٹس فیڈریشن کے سیکرٹری نے لاہور کے کھلاڑی سجاد منیر کے خلاف انضباطی کارروائی کی اور اسے معطل کر دیا۔ اور لاہور کے ایک دوسرے کھلاڑی علاؤ الدین کو بھی وارننگ دی گئی۔

دونوں کھلاڑیوں نے ان الزامات کو بے بنیاد قرار دیا اور فیڈریشن پر "نوکرشاہی انداز" اختیار کرنے کا الزام عائد کیا۔

مرکزی زون باڈی نے کھلاڑیوں کا ساتھ دیا۔ اور پاکستان اسکواش فیڈریشن کے سیکرٹری کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ ان کا یہ مطالبہ منظور نہیں ہوا تو انہوں نے قومی چیمپئن شپ کو بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور تربیتی کیمپ میں اپنے کھلاڑیوں کو شامل ہونے کی اجازت نہ دی۔

ہم اس تنازعہ میں پڑنا نہیں چاہتے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط ہے۔ مگر ایک بات ضرور کہیں گے کہ اس جھگڑے کی وجہ سے اسکواش کا ایک عمدہ کھلاڑی علاؤ الدین ضائع ہو رہا ہے۔ یہ ایک نوجوان کھلاڑی ہے اور اس میں چیمپئن —— بننے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔

بقیہ: ضیا سرحدی کی یادداشتیں

اس کا پہلا سیٹ لگا دیا جائے گا لیکن ان تمام توقعات کے برعکس ایک روز ساری صورت حال بدل کے رہ گئی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ محبوب نے دفعتاً اختری کو اپنی فلم سے ہٹا کے ارونا دیوی کو کاسٹ کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔

ارونا دیوی لاہور کی ایک عیسائی لڑکی تھی جو شکل وصورت کے لحاظ سے تو بلاشبہ بہت ہی معمولی تھی لیکن اس کے انداز گفتگو میں بلا کی کشش تھی۔ اور اس کا ایک ناقابل فراموش گُر یہ بھی تھا کہ وہ اپنی خاص قسم کی نظر بازی اور انداز تکلم سے جس کو چاہتی تھی اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی تھی چنانچہ محبوب کو بھی اس نے تنہائی کی ایک دو ملاقاتوں میں رام کر لیا تھا اور دیکھتے دیکھتے محبوب نے نہ صرف اس کو اپنی فلم میں منتخب کر لیا بلکہ اس کو اپنے دل میں بھی جگہ دیدی۔ اور سٹوڈیوز کی اصطلاح میں محبوب کی Continuity (جنسی تعلق) اختری سے منقطع ہو کے ارونا کے ساتھ شروع ہو گئے۔ اختری کے متعلق بعد میں یہ معلوم ہوا کہ اس نے بھی چند ہی روز میں کسی دوسری فلم کمپنی کے ہدایت کار سے راہ ورسم پیدا کر کے اس سے معاہدہ کر لیا اور سا گر سے علیحدگی اختیار کر لی۔

اس مسئلہ پر ایک روز جب محبوب کے ساتھ اکیلے میں میری گفتگو ہوئی اور میں نے اس کو جتایا کہ اس نے اختری کے حق میں ناانصافی سے کام لیا ہے تو محبوب نے مسکرا کر مجھے کہا "کہ میں سالا کرتا تو کیا کرتا بھن ——— ارونا نے ایسے کلوزاپ (اشارہ بازی) دیئے کہ اپنے کو چکر میں ڈال دیا۔

(باقی آئندہ)

آج ہم آزادی کی ۲۴ ویں سالگرہ منا رہے ہیں





ٹی سی پی

ملّت کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتی ہے
اور ملک کے لئے اپنی خدمات از سرِ نو وقف کرنے کے
ساتھ ساتھ...

معیاری برآمدات

کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ زرِ مبادلہ حاصل کرنے کا عہد کرتی ہے۔



ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ

پریس ٹرسٹ ہاؤس — آئی — آئی - چندریگر روڈ — کراچی
ڈھاکہ — چٹاگانگ — کھلنا — لاہور — پشاور

ORIENT

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
19-26 AUGUST, 1971

تینوں لیگوں کے انضمام کے بعد اُن سے نمٹنے
کے لئے ہمیں اور بھی سہولت ہو گی (بھٹو) خبر

میاں طفیل محمّد اور نصر اللہ خاں نے مطالبہ کیا ہے
کہ عام انتخابات نئے سرے سے کرائے جائیں۔
(خبر)

PRINTED AT: HAQQI OFFSET PRESS, LIAQUATABAD, KARACHI